آنچل

احمد ندیم قاسمی

شفیق بکڈپو

اُردو بازار جامع مسجد دہلی

مطبوعہ ... ... لاہور پریس دہلی

تعداد ... ... صرف تین سو

ناشر

شفیق بک ڈپو دہلی

قیمت :- سات روپے صرف

ملنے کا پتہ :- ایشیا بک سینٹر ۵ بھگت سنگھ روڈ۔ خوریجی دہلی ۵۱

دیباچہ

"آپ کے افسانے کا بنیادی خیال کیا ہے؟" "آپ ایک ہی موضوع پر لکھتے لکھتے اکتا نہیں جاتے؟" "آپ افسانوں میں شاعری کیوں کرتے ہیں؟" "آپ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی ترقی پسند افسانے نہیں لکھتے یہ بری بات ہے" "آپ اچھے افسانہ نگار نہیں" "آپ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں" "آپ انسان کے آنسوؤں اور بارش کے جھالوں کو ہم آہنگ نہ کیا کریں، فطرت بڑی بے درد ہے" "آپ افسانے میں تھیم کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں یا پلاٹ کو؟" "آپ نے جدید افسانہ کی ٹکنیک پر کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟" ہر افسانہ نگار کی زندگی میں اس قسم کے سوالات کو بہت دخل رہا ہے، لیکن ایک صاحب کے سوال سے تو میں ایک روز چونک پڑا "آپ افسانہ کیوں لکھتے ہیں؟"

اس سوال نے مجھے سوچ میں ڈال دیا۔ واقعی میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں، آخر ادب کی بے شمار دیگر اصناف بھی تو ہیں۔ اس سوال کا جواب دینا کچھ ضروری نہ تھا۔ کیونکہ سوال پوچھنے والے صاحب افسانہ نگار نہیں تھے، یعنی ان کے دماغ میں "فتور" نہیں تھا۔

اور یہاں؟ یہاں تو یہ دنیا، یہ انسان، یہ موسم، یہ رات دن کے چکر۔ سب کو مقررہ اقدار سے الگ ہو کر دیکھا جا رہا تھا۔ یہاں تو یہ کوششیں جاری تھیں کہ ایک پگڈنڈی پر جاتا ہوا اکیلا نوجوان اگر آس پاس بکھرے ہوئے کھیتوں کو نہیں دیکھتا، تو کیوں نہیں دیکھتا اور اگر دیکھتا ہوں تو متاثر کیوں نہیں ہوتا۔ اور اگر متاثر ہوتا ہے تو اس تاثر میں تھکن اور ماندگی کیوں ہے۔ اور پھر یہ نوجوان جو تحصیلدار صاحب کا چرمی صندوق اور خوبصورت ہولڈال

اٹھائے ہوئے ہے یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اسے اس مشقت کی کوئی اجرت نہیں ملے گی، اُسے یہ سامان فرش پر پٹخ کر اور اکڑ کر کہنا چاہئے۔ میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں، اور انسان انسان کا غلام نہیں رہ سکتا، یہ تخلیق کے مقاصد کے منافی ہے۔" اور یہ لڑکی جو کنواری ہے مگر کنواری نہیں لگتی، گلی کی نکڑ پر رک کر سبزی بیچنے والی بڑھیا سے یہ کیوں پوچھ رہی ہے "خالہ آجکل ہر چیز مہنگی کیوں ہو رہی ہے؟ اور قریب کی ایک چھت پر ایک نوجوان کھنکار کر یہ کیوں کہتا ہے "جنگ کا زمانہ ہے نا" یہاں تو گھورے پر پڑے ہوئے اس چیتھڑے کی "تاریخ" پر غور کیا جاتا ہے، جو کرسی نشین صاحب کے دالان سے کوڑے کے ساتھ آگرا ہے۔ اور پھر ایک دہقان کی سفید قمیص میں سیپ کے بٹن سرخ دھاگے سے سیتے ہوئے۔ اور فصلوں کی بری حالت کے باوجود تھانیداری گھوڑی کے اکڑے ہوئے پٹھے جنہوں نے گوشت کے گدگدے لوتھڑوں کو جکڑ رکھا ہے اور یہ ادھیڑ عمر کی عورت جو آج خلافِ معمول غروبِ آفتاب سے قبل ہی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو چکی ہے اور ہاتھ منہ کو انگریزی صابون سے دھو رہی ہے۔ اور یہ موچی جو پٹواری کا جوتا تیار کرتے وقت ہر ٹانکے کے بعد کہتا ہے ــ "ہت تیری پٹوارن" وغیرہ وغیرہ۔

یہ دماغی "فتور" کے ثبوت ہیں لیکن آخر اس دیوانگی اور سودائی پن کی نشر و اشاعت کے لئے افسانہ کیوں؟

جواب سوجھا ہے، لیکن میرے ترقی پسند دوستوں کی توقعات کے قطعاً خلاف۔ یہاں پھر شاعری آدھمکی ہے۔ یعنی وہ احساس لطافت۔ وہ گداز روح۔ جس کے بغیر نہ خدا کا تصور کیا جا سکتا ہے، نہ کائنات کا، نہ آدم کا، اور نہ آدم کی ننھی خوشیوں اور ہمالوی دکھوں کا۔

ہیں پھولوں کے انبار کو پسند نہیں کرتا۔ گلدستوں میں پتیوں کے مرجھانے کا احتمال ہوتا ہے، میں ستاروں کے جھگھٹ کو پسند نہیں کرتا، اس طرح نگاہیں بھٹک جاتی ہیں، میں انسانوں کے ہجوم کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ ہجوم کا تصور صرف قیامت سے متعلق ہے ۔ مجھے ایک پھول، ایک ستارہ، ایک انسان چاہیئے ___ اور اس وحدت کو صرف افسانہ ہی سہارا دے سکتا ہے، میں ایک پھول کی پنکھڑیوں کا ذکر کروں گا، تو سب پھولوں کی نمائندگی ہو جائے گی، میں ایک ستارے کی پرواز کا حال بتاؤں گا، تو سارے نظامِ شمسی کی سیمابی سرشت کا احساس مکمل ہو جائیگا میں ایک انسان کو اپنے فن کا مرکز بناؤنگا۔ تو ہبوطِ آدم سے لیکر موجودہ دور تک کا انسانی سفرنامہ سامنے آجائے گا، مجھے وحدت سے محبت ہے، نقادوں کی زمانی اور مکانی وحدتیں میرے نزدیک محض اضافی حیثیت رکھتی ہیں، مجھے ایک خدا چاہیئے، اور ایک کائنات اور ایک انسان متفق اور مجتمع ۔"

اور اسی لئے میں افسانہ لکھتا ہوں ،

جس وقت میرے احساس و شعور نے افسانے سے کوئی بہتر صنف ایجاد کی، تو میں خود بخود اپنا رستہ بدل لونگا، فی الحال بحیثیت نثر نگار مجھے افسانے سے بہتر کوئی ایسا ذریعۂ اظہار میسر نہیں آسکا۔ یا سوجھ نہیں سکا۔ جو زندگی کے مختلف رنگ پیش کرنے میں میرا معاون ثابت ہو۔

لیکن یہ میرے افسانوں کے رنگ ڈھنگ ۔ آخر میری کہانیاں دورِ جدید کے سانچوں میں ڈھل کر کیوں نہیں نکلتیں۔ میں نفسیات کی ایک گتھی پر صفحوں

کے صفحے کیوں سیاہ نہیں کرتا، میں فیشن ایبل "اندازِ بیان سے کیوں احتراز کرتا ہوں، اپنے تمام نوجوان دوستوں کے افسانوں سے میرے افسانے مختلف کیوں ہیں، یا بقول کسے "پیچھے کیوں ہیں؟"

تو حضرت بات یہ ہے، کہ میں اپنے ذہن، اپنے تصور، اور اپنے عقیدہ سے ریاکاری برتنے کا قائل نہیں، اپنے افکار کا وزن معلوم کرنے کیلئے میرا احساس ہی بہترین ترازو ہے، اگر میری کوئی ٹکنیک ہے تو وہ محض خلوص ہے، اگر میرا کوئی موضوع ہے تو وہ محض انسانی زندگی ہے، اگر میرا کوئی اسلوب ہے تو وہ محض میری شاعرانہ افتادِ طبع کا پرتو ہے، بغیر کسی قسم کی خودستائی کے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں، کہ میں فنکار ہوں، اور میں فن کو اصطلاحات کا اسیر نہیں بنانا چاہتا، اس جبر کدے میں دوسری غلامیاں کیا کم ہیں، کہ اتنی پاکیزہ نعمت کو بھی لاٹھی کے سہارے گھسیٹتا پھروں۔

وقت بہترین نقاد ہے، اور میں اپنی ادبی کاوشوں کو وقت کے حوالے کرتا ہوں، اگر ان میں کوئی جوہر ہے، تو دنیا کی کوئی قوت ان کی تابانیوں کو نہ چھین سکے گی، اور اگر یہ محض ذہنی آوارگی کی پرچھائیاں ہیں، تو یہ خود بخود مٹ جائیں گی، اور اس وقت میں کسی بیرونی قوت کو متہم گردانے بغیر یہی کہوں گا۔ کہ میرا خلوص بے لوث نہ تھا۔

میور روڈ۔ لاہور
۱۰ مئی ۱۹۴۴ء

ا۔ن۔ق

محدب شیشے میں سے

انگڑائی

پھول کسے پسند نہیں؟ بڑے بڑے جدت پسند مفکر بھی اپنی دلیلوں
کو سلیس شکل میں پیش کرنے کے لئے استعاروں اور تشبیہوں میں پھولوں
کا سہارا لیتے رہے، مجھے بھی پھول پسند تھے، مگر جانے کیا سبب تھا، کہ
پھولوں کے جمگھٹ میں مجھے کوئی پھول اچھا نہیں لگتا تھا۔ مجھے چٹیل ویرانوں
میں کسی کنکر کی اوٹ میں اُگا ہوا وہ پھول بہت پیارا لگتا تھا، جو ایک حقیر سی
ڈنڈی پر تتلی کی طرح بیٹھا ہوتا۔ آس پاس ریت ہوتی، کنکر ہوتے، کانٹے
ہوتے، سب کچھ ہوتا مگر کوئی اور پھول نہ ہوتا۔

مجھے میرے دوست کہتے "تو پاگل ہے! تجھ میں جمالیاتی حس کا فقدان ہے
تیرا وجدان کائنات کے حسن کو اپنے احاطے میں نہیں لے سکا۔ تجھے سوچنا چاہیئے
سمجھنا چاہیئے۔

لیکن میں سوچ چکا تھا اور یقین کر چکا تھا کہ ہجوم میں الجھن ہے گڑبڑ ہے
افراتفری ہے، اور تنہائی میں رعنائی ہے، اطمینان ہے اور وہ سب کچھ ہے جو فنون

لطیفہ کی روح سمجھا جاتا ہے،

میں بچپن سے آوارہ مزاج تھا۔ میں نے ہولناک راتوں میں اندھیری گھاٹیوں کی بے ڈھب چٹانوں پر بیٹھ کر جگنوؤں کی آنکھ مچولی دیکھی تھی میں نے سنسان دوپہروں میں کانپتے ہوئے افق کو چھونے کی دھن میں اچھوتے ٹیلوں کو اپنے قدموں سے منقش کیا تھا۔ میں کنواری صبحوں اور سانولی شاموں کی سوچتی ہوئی سنسناہٹوں میں مادرِ فطرت کی نرم و گرم انگلیوں سے کھیلا تھا میں نے جھرنوں کے ساز سنے تھے۔ میں نے بیل کے پتوں کا رقص دیکھا تھا۔ میں نے خراش کے درختوں تلے دفعت کے لبادے کی سرسراہٹیں محسوس کی تھیں یہی وجہ تھی کہ میں اسکول میں نالائقوں کا امام تصور کیا جاتا تھا۔

جوان ہو کر میں نے زندگی کی کتاب کو قسم قسم کی تصویروں سے مزین کرنا چاہا۔ سب سے پہلے میں نے بانسری سیکھی۔ رسیلے نغموں کی پھوار میں بھیگ کر جب میں نے آنکھیں ملیں۔ تو یہی نغمے چیخیں بن گئے ہیں۔ بانسری پر لپٹے ہوئے طلائی بند اتار دیئے اور ایک سنہری انگوٹھی بنوالی۔

اس کے بعد میں نے اپنے وطنی گیتوں کی طرزیں یاد کرنا شروع کیں۔ دن بھر گلا چلایا گٹکریاں چھوڑیں۔ پلٹے کھائے اور جب میں ایک بہت بڑا گویا مشہور ہو گیا۔ تو ایک روز ایک صاحب نے بولے تمہیں کسی استاد سے راگ کے سبق لینے چاہئیں۔ تمہاری آواز میں رس ہے مگر تال سُر کا اتار چڑھاؤ مسلسل نہیں"۔ اسی روز میں نے سکہ پھونک لیا۔ اور اپنے خیالوں کے برے گھرے سے سنگیت دیوی کی مورتی اٹھوا دی۔

میرے وطن میں رقص گناہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جب فطرت خود سب سے بڑی رقاصہ ہے تو اس کے پجاری کا اس تڑپ سے بیگانہ رہنا انتہا درجے کی دانا

ہے۔ بھو ایک مشہور رقاص سے میں نے اعضائی لچک کے سبق سیکھے ہتھیلیوں کو موڑا۔ باہوں کو لہرایا۔ کمر میں بل ڈالے مگر ایک مرتبہ ایک تیز ناچ کے دوران میں میرا شِنہ اتر گیا۔ پندرہ روز ہسپتال میں رہا۔ اور جب وہاں سے نکلا تو میرے بھائی جان مجھے ایک دوست کے پاس لے گئے۔ جنہوں نے مجھے محکمہ امداد باہمی میں سب انسپکٹر بھرتی کر لیا۔

یوں تو ایک آوارہ منش نوجوان دنیاوی شکنجوں میں جکڑ دیا گیا۔ حکمانہ تربیت حاصل کرنے کے بعد ایک روز میں اپنے ہیڈ کوارٹر نور کوٹ سے ایک دور افتادہ گاؤں سنگجانی میں رجسٹروں کی پڑتال کرنے جا رہا تھا۔ سائے ڈھل چکے تھے اور سورج کے آس پاس ہلکے پھلکے بادلوں کی پونیاں سی اڑتی پھر رہی تھیں۔ بہت اونچی اڑتی ہوئی ابابیلیں ہوائیں دائرے بنا رہی تھیں۔ اور نیچے لہروں بھرے ٹیلوں پر زندگی نے خاموشیوں کی چادر تان رکھی تھی۔

میرے قدموں کی خش خش جیسے چپ چاپ منظر کے کلیجے پر نشتر چلائے جا رہی تھی۔ اوّل اوّل جب مجھے اس وحشت ناک چاپ کا احساس ہوا تو میں نے اپنی رفتار مدھم کر دی۔ مگر دھیرے ہوتے بھی چاپ گرج اور کڑک میں بدلتی گئی اور میں ایک سوکھی سڑی ببول کے پاس جا کر رک گیا۔ اچانک ایسا سکوت چھا گیا کہ اپنے ہی دل کی دھمک سے مجھے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ــــــ "یہ بھی خوب رہا" میں نے سوچا۔ یعنی سکوت کی دیوی ایسی شریر ہے کہ اس کے احترام کے لئے اگر اتنے ضروری اور طویل سفر کو ملتوی کر دیا جائے تو بھی وہ راضی نہیں ہوتی۔ بلکہ براہ راست دل پر اثر انداز ہوتی ہے، آخر کہاں جائے یہ بدبخت انسان جس کے پاس اگر کوئی سرمایہ ہے۔ تو وہ محض دل کی دھڑکن ہے۔

دل کی صدائیں اَن سُنی نہیں کہی جا سکتی۔ اس لیے سکوت قیامت
مکمل نہیں ہو سکتا۔ سکوت صرف فریب ہے۔ دراصل صرف خاموشی کا یہ تصوّر ان
دنوں کا ہے، جب آدم کا وجود محض ایک الوہی سوچ تھا۔ اور زمین ایک بیکار سیارہ
جب چپ چاپ خلاؤں میں چاند کی کرنیں بے مقصد لرزتی رہتی تھیں اور سورج
کا قرص پرانے طشت کی طرح گرد آلود رہتا تھا۔ آدم کی تخلیق دراصل شور و شغب
اور چیخم دھاڑ کی تخلیق تھی۔ بیداری میں اس کے لب ہلتے ہیں، اُس کے قدم چاپ
پیدا کرتے ہیں۔ خواب میں اس کا دل دھڑکتا ہے، خیال اپنے پروں کو پھڑپھڑاتے
ہیں، موت کے بعد اس کی روح آنسو بن کر کھلے کھنڈروں پر بلکتی ہے، اور مقبروں
گنبدوں میں سنسناتی ہے، سکوت فریب ہے، زیاں زندگی ہے!
میں فانی کا ایک شعر گنگنانے لگا۔

میری ڈھارس بندھی۔ سامنے کپکپاتا ہوا افق اپنا بے کراں آغوش کھولے
مجھے بلا رہا تھا۔ سورج کے اِرد گرد اُڑتی ہوئی پونیاں گالے بن گئی تھیں۔ ابابیلیں
نیچے اتر آئی تھیں۔ میری آواز ٹیلوں کی لہروں سے ٹکراتی فضا میں تھرتھری پیدا
کر رہی تھی

میں اب اپنا سفر جاری کر چکا تھا۔ لیکن میں اداس تھا۔ میں تنہائی کو پسند
کرتا تھا۔ اُن دنوں تنہائی کے متعلق میرا نظریہ دنیا سے الگ تھا۔ ایک چپ چاپ
ساتھی، جسے صرف دیکھا اور محسوس کیا جا سکے۔ تنہائی کو مکمل کرنے کیلئے ضروری
ہے میں نے جیب سے قلم نکالا۔ اُسے انگلیوں میں گھمایا۔ ماتھے پر پھیرایا۔ ناک
کو چھوا ـــــ

میرا گونگا ساتھی۔ میرا بے زبان ہمسفر! فضا نے اب ایک اور رنگ بدل لیا تھا
یہ فضا بھی عجیب چیز ہے۔ انسانی احساسات سے اُسکا کتنا گہرا تعلق

ہے روؤ تو یہ فضا بھیگ جائے گی، ہنسو تو یہ فضا کھلکھلا پڑیگی، سوچو تو اس پر بھی مفکرانہ سنجیدگی چھا جائے گی، انسان فضا کا لاڈلا ہے، فضا انسان کی ماتا ہے یہ بے کراں فضا ــــــ جس کے خزینے میں سناٹے بھی ہیں اور نغمے بھی پھواریں بھی ہیں اور جھالے بھی، جھونکے بھی ہیں اور صرصر بھی ــــــ یہ کہیں نہ ختم ہونے والا آغوش ــــ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس لطیف اور عفیف فضا کا ایک جزبن گیا ہوں، ہوائیں مجھے جھولا جھلا رہی ہیں تو کرنیں میرے بالوں میں شانہ کر رہی ہیں۔ میں تنہا نہیں۔ میرے چار طرف فضا ہے اور میں اس کی لامحدود پہنائیوں میں تیرتا جا رہا ہوں۔

لیکن خیالوں کی یہ پھریریاں اگر ابدی ہوتیں تو کوئی فلسفی دکھی نہ ہوتا اور کسی شاعر کے لبوں سے غمناک نغمے بلند نہ ہوتے۔ کیوں کہ مفکروں کے ذہن پر کبھی کبھی ایسی حالتیں طاری ہو جاتی ہیں، جب زندگی جنت کی سنی سنائی باتوں کا مجسم نمونہ بن جاتی ہے ــــ لیکن یہ حالتیں لمحاتی ہوتی ہیں ــــ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں لپکنے والے کوندے کی طرح روشن مگر فانی!

میں پھر اداس ہو رہا تھا کہ اچانک میرے سامنے ایک کھجور ابھری، مجھے اُس روز محسوس ہوا کہ خضر بے جان چیزوں کا روپ بھی دھار سکتے ہیں میں تیز تیز قدم اٹھاتا جب اُس ریگستانی چھتری کے قریب پہونچا، تو اُس کے منقش تنے کے قریب ایک پھول ننھی سی منڈی پر مسکرا رہا تھا۔

پھول کسے پسند نہیں۔ لیکن میں اکیلے اکیلے پھول کو سب پھولوں کا راجہ سمجھتا ہوں۔ اُس پھول کے پاس بیٹھ کر میں خضر کو بھول گیا۔ جس کی چھدری چھاؤں سنہری ریت پر کشیدہ کاری میں معروف تھی۔

یہ کوئی عجیب سا پھول تھا، اِس کی پنکھڑیوں میں نزاکت کے علاوہ گدراہٹ

بھی تھی۔ اس کی دوشیزگی میں اچھوتا پن تھا۔ جیسے اُسے چھو لینا اس کی موت ہے
گوری پنکھڑیوں کی ننھی سی پیالی میں چار باریک سنہری تار تھے، اس ہری کٹوری
کو ایک ڈنڈی کی سبز ہتھیلی نے تھام رکھا تھا۔ نیچے تین پتے تھے، جن پر ریت کے
ننھے ننھے ذرے جم گئے تھے۔ یہاں نہ کوئی تتلی تھی نہ بھنورا کہ پھول میں رعونت
پیدا کرتے، وہ بھولا بھالا۔ اکیلا اکیلا ننھا مُنا پھول اتنے وسیع میدان کے ڈر لوٹنے
پھیلاؤ میں حسب بساط جھوم رہا تھا ـــــ لیکن اُس نے کھجور کی پناہ کیوں لی
یہاں پھر میں خود آدھمکا۔ انسان بڑا خود غرض ہے، وہ ہر حقیقت کو استعارہ
بنا لیتا ہے، اُسے یہ خیال تک نہیں آتا کہ ہر کنکر، ہر تنکا، ہر ذرہ نظام کائنات کا
ایک اَن تھک کارندہ ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں وہ سب کا مددگار ہے
لیکن میں سوچنے لگا کہ پھولوں کے اس راجہ نے تو بالکل انسانوں کی سی حرکت
کی، کھجور کے نیچے اُگا تاکہ دھوپ کی تیزیاں اس کی پنکھڑیوں پر اثر انداز نہ ہوں۔
جیسے کمزور اور نہتی ریاست قوی اور مسلح سردار کی باجگذار ہو جاتی ہے تاکہ
جہاں بانوں کی یلغاروں سے محفوظ رہے۔

پھر بھی اس پھول نے میری پریشان خیالیوں کو پناہ دی، میں دیر تک
اُسے دیکھتا رہا۔ اور جب سورج کو مغرب کے غار کی طرف لڑھکتا پایا تو میں
نے اپنا سفر جاری کرنا چاہا۔ اُٹھتے ہوئے میں نے پھول کو چھو لیا۔ اور اس کی
پنکھڑیاں ایک ہو کر ریت پر بکھر گئیں۔ پتے تھرتھرا اُٹھے اور ڈنڈی لچک گئی
ہولناک طوفانوں اور برق رفتار آندھیوں میں یہ ننھی سی جان زندہ رہی، مگر
محبت کے ایک مَس سے اس کے انجر پنجر بکھر گئے ـــــ کیا انسان واقعی اشرف المخلوقات
ہے یا محض تباہی اور بربادی کا پیامی ـــــ!

پھول سے محروم ہو کر حقیر ڈنڈی اور پتے بے رنگ ہو گئے، کھجور کی شاخیں

اپنے خنجر ہلانے لگیں، آسمان پر بدلیوں نے پھٹے ہوئے دوپٹوں کی شکل اختیار
کرلی۔ ابابیلیں غائب ہوگئیں۔ اور ٹیلوں کی بے کراں دنیا کوؤں کی کائیں کائیں
سے وحشت زدہ سی نظر آنے لگی۔

کوّے انسانی آبادی کا نشان سمجھے جاتے ہیں، کیونکہ جہاں انسان ہوگا
وہاں آس پاس کوّے بھی ضرور ہوں گے، صحبتِ ہم جنس کا یہ ایک نیا پہلو
ہے، جس کے متعلق حکیموں نے سوچا ہے نہ شاعروں نے۔ نہ جانے کس تعصب
کی بنا پر زمین و آسمان کی پہنائیوں میں اترتے ہوئے رازوں پر جھپٹنے والوں نے
کوّوں کو موجوداتِ عالم سے خارج کر رکھا ہے۔

اب پگڈنڈی چوڑی ہو رہی تھی۔ اور کبھی کبھی مجھے کوئی مسافر بھی مل جاتا تھا
جو میرے سفید کپڑوں اور سنہری عینک سے متاثر ہو کر مجھے سلام کرنے کے
بعد دور تک پلٹ پلٹ کر دیکھتا جاتا تھا اور جب سامنے دھوئیں کا ایک بادل
زمین سے چمٹا ہوا دکھائی دیا۔ تو مجھے ایک راہی سے معلوم ہوا کہ میری منزل آ پہنچی
اب کھیتوں کی قطاریں شروع ہو گئیں۔ پگڈنڈی زیادہ گہری ہو گئی تھی
پربت کی چوٹی پر آفتابی الاؤ جلا گیا۔ شفق نے اکا دکا بدلیوں پر گلابی چھینٹے
پھینکے اور اندھیرے میں تحلیل ہو گئی، معاً سنگجانی کی مسجد سے اذان کی
سریلی آواز بھٹکی بھٹکی ہواؤں پر بل کھاتی آئی۔ اور میرے کانوں کے رستے میری
رگوں میں جھرجھری بن کر اتر گئی —— یہ آواز کیسی اکیلی اکیلی ہے اور پھر اس
میں کیسی آفاقی بلندی اور کائناتی وسعتیں ہیں۔ اس کی تھرتھراہٹوں میں کتنی
صدیوں کے بھولے ہوئے زمزمے اور کتنی قرنوں کے خاموش نغمے ہیں۔ مجھے یوں
محسوس ہوا جیسے ساری دنیا کی مسجدوں میں بیک وقت اذانیں دی جا رہی ہیں
یہ یزدانی ترانے خلا کے کسی مرکز میں جمع ہو کر ستاروں کی طرف صعود کر رہے ہیں

اور انجستان میں بیٹھی ہوئی منتظر روحوں کو یہ پیغام پہونچاتے ہیں کہ ابھی انسانیت زندہ ہے ابھی آدم کو اپنے غیر فانی جوہر کا احساس ہے ابھی زندگی کا ذوقِ عبوریت فنا نہیں ہوا۔

گاؤں کی پہلی گلی میں ایک کتیا کو چمکارتے ہوئے کتے نے بھونک کر میری ان سوچوں کا تار پود بکھیر دیا۔ اور میں چلایا "ہٹ جا" ——— اور کتیا بھاگ نکلی کتے کو شاید ایک مسافر کی سوکھی سکڑی پنڈلی سے اپنی کتیا زیادہ عزیز تھی اس زور سے بھونکا جیسے کہہ رہا ہے "دفع ہو" ——— اور اپنی مفرور محبوبہ کے تعاقب میں ایک پست سی حد بندی پھاند کر غائب ہو گیا۔

ذیلدار کے ہاں میری بڑی خاطر مدارات ہوئی۔ دوسرے روز ڈرتے جھجکتے دیہاتیوں کو بلایا گیا۔ حساب کتاب کی پڑتال ہوئی۔ چند لوگوں کے ذمے مدتوں کی قسطیں نکلیں۔ جن کے متعلق باقاعدہ کارروائی کا مشورہ کیا۔ عصر کے وقت میں نے واپس چلنے کا خیال ظاہر کیا تو وہ مہمان نواز ذیلدار بگڑ گیا ——— یعنی آپ بتیس کوس پیار (؟) فرا اکیلے طے کریں گے؟ اس ریت کے سمندر میں! ——— رات کو؟ ——— اللہ اللہ کیجئے صاحب۔ اور پھر میرا گھوڑا ابھی تو آج کھانے دانے منگوا لیا ہے، شام تک واپس آجائیگا صبح صبح چلے جائیے گا۔"

لیکن میں نے اصرار کیا۔ بیچارے کو میری اِ ارتنگی کا علم نہ تھا۔ تکلف کے تمام حربے استعمال کئے، اور آخر مان گیا۔ ایک بڑے مجمع کے ساتھ مجھے گاؤں سے باہر تک چھوڑنے آیا۔ راستے کے خطرات سے آگاہ کیا۔ آندھی طوفان کی حالت میں چند ٹھکانوں کا بھی پتہ دیا۔ اور سب جھک کر ملتے رخصت ہو گئے۔

جب شام ہونے کو آئی، تو شکست خوردہ آفتاب کے چہرے پر ہوائیاں دیکھنے کے لئے میں نے پلٹ کر پچھم کی طرف نظریں دوڑائیں گھنگھور

گھٹا امڈی چلی آرہی تھی! نرم ہوا کی خنکی نے میرے اعصاب کو تھپکی سی دی، اور میں تھکن سی محسوس کرنے لگا. لیکن یہ لذت ناک تھکن معاً خوف میں بدل گئی. اگر ہوا اور بارش کا یہ طوفان اِدھر کا رخ کرے، تو ــــ؟

میں نے ذیلدار کے بتائے ہوئے ٹھکانوں کی تلاش میں اس پاس دیکھا بہت دُور اُتر کی طرف مجھے دھواں سا دکھائی دیا. لیکن گھٹا دور تھی. ہوا خنک تھی اور میں جوان تھا. تیز گامی کی کٹھائی اور مٹھیاں بھینچ کر یوں قدم اٹھائے کہ، ریت میرے قدموں تلے دھڑکنے لگی.

لیکن گھٹا مجھ سے زیادہ تیز گام ثابت ہوئی. میرے سامنے ایک بوند گری اور یہ اکیلی ننھی سی بوند مجھے اتنی اداس اور پیاری معلوم ہوئی کہ جی چاہا اسے ریت پر سے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لوں. یہ معصوم سی جان ــ کسی تخریبی تبدیلی کی دامن افشانی کا شکار! ــــ مجبوبانہ شوق سے میں اس بوند کی تلاش میں جھکا، مگر یہ بوند ریت کے صاف چہرے پر چیچک کا داغ بن کر چیک گئی تھی ــ اور پھر ایکدم بجلی چمکی اور آس پاس پھیلا ہوا ریگزار سونے کے تالاب کی طرف جھلک اُٹھا. اُتر کا ٹھکانہ میرا سہارا بنا رہا. میں نے بڑی مشکل سے اُتر کی سمت مقرر کی، اور بھاگنے لگا.

چنگھاڑتے ہوئے اندھیرے میں بھٹک بھاگنا. منزل سے بے خبر ہونا. خوف اور ہیجانی جذبۂ مسرت کا گھل مل جانا ــــ! میں سوچنے لگا کہ کاش کوئی کہانیاں لکھنے والا مجھے یہاں دیکھ لیتا. اور پھر مجھے مرکزی موضوع بنا کر ایک ایسی کہانی ڈھالتا، جس کے سامنے الف لیلہ کے شہزادے گرد ہو کر رہ جاتے!

تیز اور موسلا دھار بارش میں نرم ریت پر گرنا تکلیف دہ ہونے کی بجائے لذت ناک ہوتا ہے. اس اُفتاد میں بھی ایک رعنائی ہے. میں اونچے نیچے ٹیلوں

پر جھرتا پڑا با نیتا کا نپتا بڑھتا چلا گیا۔ اور آخر جب بجلی چمکی تو مجھے محسوس ہوا کہ کرگس کے شیش محل پر پانی پھر گیا ہے۔ عینک سے مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں رومال کو ٹٹولا۔ لیکن وہ بھیگ چکا تھا۔ مایوس ہو کر عینک اتاری اور بجلی کی چمک کا انتظار کرنے لگا۔ معاً مجھے اپنی دائیں جانب ایک مکان کا گمان سا ہوا۔ ادھر کا رُخ کیا تو ایک باڑ میں الجھ گیا۔ بڑی مشکل سے چھٹکارا ہوا۔ بجلی چمکی تو میں لپک کر دروازے تک جا پہنچا۔ اور کواڑ پر دستک دی۔ یہ دستک بادل کی کڑک میں غوطہ مار گئی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر کواڑوں کو کھٹکھٹایا اور ساتھ ہی پکارا۔ "ارے بھئی۔ کواڑ کھولنا!"

کھٹ کھٹ کھٹ۔ کواڑ کھلے اور میں اندر رینگ گیا۔ آنکھیں مل کر میں نے سامنے دیکھا۔ ادھیڑ عمر کا ایک دہقان مجھے ترحمانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ "بھئی تم تو بالکل بھیگ گئے ہو۔ کہیں دور سے چلے ہو شاید۔ ہے نا؟ یہ لو میری چادر۔ یہ کپڑے اتار دو۔ ٹھنڈ لگ جائیگی — اور — اے فلکے — دو چار جھانکڑیں جلا دے۔ آگ تاپ لے بیچارا!"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کپڑے اتارتے ہوئے دل میں کہا۔ "اے کھلے میدانوں کے قلب میں بسنے والے انسان اے متمدن دنیا سے کوسوں فرسنگوں دور رہنے والے ابن آدم! اگر میرا بس چلتا۔ تو میں تجھ پر وہ تمام تہذیبیں نچھاور کر ڈالتا۔ جو علم و ادب کی ترقی میں ممکن ہیں۔ مگر جنھوں نے انسانی اقدار سے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ تو سادہ مزاج ہے۔ تو غریب ہے تو مخلص ہے۔ تیرا دل کائنات سے بھی وسیع اور تیرا حوصلہ آفاق سے بھی بلند ہے۔ کیا ہوا اگر تو نے شیکسپیئر کے ڈرامے اور فرائڈ کے خطبات نہیں پڑھے کیا ہوا اگر تو افلاطون کی جمہوریت اور اقبال کے مرد مومن سے بیگانہ ہے تو شیکسپیئر سے زیادہ نوع انسان کا ہمدرد ہے۔ تو فرائڈ سے زیادہ دور اندیش ہے تو افلاطون

سے زیادہ سچائیوں کا پرستار ہے اور تجھ میں اقبال سے زیادہ قوت خودی ہے!"

معاً دہقان پکارا۔ "اے بیٹی ــ اے صابی ــ ارے! یہ تو سو گئی ملک،
صابی کو جگا کر کہہ دے کہ پرے کوٹھے میں چلی جائے۔" جھانکڑیں پھر جلا اٹھیں۔
کونے میں گودڑوں کے انبار سے صابی یوں اٹھی۔ جیسے گرد آلود سیپ سے
موتی اچھل پڑے۔ میری طرف یوں دیکھا، جیسے دیہاتی چھوکرے ہوائی جہازوں
کو دیکھتے ہیں۔ شانوں اور گالوں پر چھائے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر ڈبیہ لگاتی دوسرے
کوٹھے میں یوں سرک گئی۔ جیسے ناگن تالاب سے نکل کر جھاڑی میں گھس جائے۔ یا
جیسے رات کے اندھیرے میں ریل کے انجن کی روشن پیشانی لائٹ کا اچانک موڑ کاٹ
جائے۔

اور میں نے اپنے کپڑوں نچوڑ کر ایک الگنی پر لٹکاتے ہوئے اپنے جی میں کہا! "اے تنگ
طرف النسان! اے، جد گنوار! اے لکیر کے فقیر! اگر میرا بس چلتا تو تجھے باہر باڑ پر پھینک آتا اور تیری
صابی کی نیندوں کو پریشان نہ کرتا۔ تو اتنا کوتاہ نظر ہے کہ تجھے میری آنکھوں میں میری
خاندانی شرافت کی تابانی نظر نہیں آتی۔ میں لڑکیوں کو چھیڑنے کا قائل نہیں۔ میں انھیں
صرف دیکھنے اور دیکھتے رہنے کا روادار ہوں۔ میں انسانوں سے بہت بلند ہوں۔ بلند
سوچنے سمجھنے والا جاننے بوجھنے والا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ صابی تیری لڑکی
ہے، اور تو اپنی لڑکی کو کسی غیر کی ہوس کارانہ نظروں کا مرکز نہیں بنانا چاہتا۔ مگر کیا!
یہ ممکن نہ تھا کہ ہم یہیں الاؤ کے ارد گرد بیٹھ کر آگ تاپتے۔ میں تم سے ان علاقوں
کے حالات پوچھتا اور اس کے بدلے میں شہروں کی کہانیاں سناتا۔ صابی بھی
سامنے بیٹھی رہتی۔ شعلے اس کے چہرے پر رنگوں کی بوچھاڑ کرتے رہتے۔ بجھی
ہوئی چنگاریاں ہوا سے اڑ کر اس کے بالوں سے لپٹ جاتیں۔ اور وہ مسکرا مسکرا
کر مجھ سے پوچھتی: "یہ کیا ہوتا ہے مسافر؟"

فلکے نے جھاڑ کر دیں جلالی تھیں۔ مجھے ایک چولا بھی مل گیا تھا۔ عینک کو صاف کر کے میں نے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور الاؤ کے قریب ایک چٹائی پر بیٹھ گیا۔ دہقان اور فلکا بھی قریب آ گئے اور اُدھر سے جیتی ہوئی کھاٹ سے ایک بڑھیا اترتی ہوئی بولی "کیسی مزے کی بات سوجھی تمہیں۔ میں تو خواب دیکھ رہی تھی کہ برف پڑ رہی ہے اور میں اور بیٹی صابی اور ——— یہ کون ہے؟" اس نے بھورے بالوں کو ایک پھٹی پرانی چادر تلے چھپا کر پوچھا "صابی کہاں ہے؟"

"بڑھیا بولا "صابی اُدھر ہے، یہ کوئی مسافر ہے۔ طوفان میں گھر گیا ہے بیچارا بھیگ گیا ہے ایڑی سے چوٹی تک۔ دور سے آ رہا ہے۔"

"کہیں نوکر ہو بیٹیا؟" بڑھیا نے مرجھائی ہوئی انگلیوں کو شعلوں میں لیجا کر ہاتھوں کو ملا۔ اور پھر انھیں چہرے پر پھیر کر بولی۔ "نوکری جان پڑتے ہو!"

میں نے کہا "ہاں نوکری ہوں۔ بھکوں کا داروغہ ہوں۔"

"بھکوں کا داروغہ!" دہقان اچھل پڑا۔

"داروغہ جی!" بڑھیا حیران رہ گئی۔

"ہے صابی" دہقان پکارا "ہے بیٹی۔ ادھر آجا۔ یہ تو اپنے افسر جی ہیں۔ چائے کی پتّی پرسوں نے آیا تھا فلکا ——— لے آیا تھا نا؟ ——— سو چائے پکا۔ دھویا ہوا تکیہ رکھ دے پلنگ پر ——— واہ! آپ نے پہلے تو بتایا ہی نہیں ——— فلکے! ادھر آ، داروغہ جی کی پنڈلیاں داب اور ——— اور ——— ہے صابی۔ مر گئی کیا؟"

میں نے مسکرا کر کہا "مگر بھئی تم اتنے گھبرا کیوں رہے ہو؟ پک جائے گی چائے۔ آجائیگی صابی۔ اور اے دادی اماں۔ تو کہاں کھسک چلی؟ آگ تاپ میں انسان ہوں۔ کوڑھی نہیں۔"

دہقان زور سے ہنسا۔ "کتنے سیدھے سادے ہیں داروغہ جی!"

"بالکل!" بوڑھی گنگنائی ــــ اور فلکا کھلکھلانے لگا۔

اب صابی تنگ دروازے سے سمٹ کر نکل رہی تھی۔ الاؤ کی چمک جب اس کے چہرے پر پڑی تو مجھے چاروں طرف چکا چوند سی پھیلتی محسوس ہوئی۔ اس نے نہایت احترام سے میری طرف دیکھا۔ پھر گھر سرپوش سے چائے کی ڈبیا نکالنے لگی۔ بوڑھا جوڑا پلنگ کے نیچے گھٹنوں کے بل دیگچی کی تلاش میں رینگتا پھر رہا تھا۔ فلکا اب جھاڑیوں کا ایک ڈھیر اٹھا لایا تھا۔ باہر بارش کا زور کم ہو رہا تھا۔ گرج کی آواز کہیں دور جیسے زمین کے شکم سے اٹھ رہی تھی اور ایک پتنگا دیئے کی لو کا لپٹ کر رہ گیا تھا۔

میں جذباتی انسانوں اور دیوانوں میں بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں کوئی جذباتی نوجوان میرا دوست نہیں بن سکتا۔ میں کنکر کو کنکر کہنے کا عادی ہوں اُسے سنگریزہ نہیں کہوں گا۔ کیونکہ کنکر میری اپنی زبان کا لفظ ہے اور میں بچپن سے پتھر کے اس ٹکڑے کو کنکر ہی کہتا چلا آیا ہوں۔ لیکن اگر کوئی دوست کنکر کو سنگریزہ کہنے پر مجھے مجبور کرے... اور مایوس ہو جائے، تیوری چڑھائے، بگڑ جائے تو میں اپنے ذہن کو ماضی اور حال کی ٹکڑیوں کا کارزار نہیں بناتا۔

لیکن صابی کے ہر عضو کے لیے مجھے کسی تشبیہ، کسی استعارے کی تلاش تھی۔ وہ آگ پر لوہے کا چولہا جما کر دیگچی میں پانی ڈال رہی تھی۔ اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے سر کی چادر چوٹی کے چند گھونگھر دل میں اٹک گئی تھی۔ ناک میں مینا کاری کی ایک کیل کے سوا اُس نے کوئی زیور نہیں پہن رکھا تھا۔ اور چونکہ آج تک مجھے اُس کے حُسن کی مثال کہیں نہیں ملی۔ اس لیے اس کا حُسن آسمانی تھا کھلتے ہوئے رنگ کے ماتھے تلے ابرو کسی مقدس صحیفے کے عنوان معلوم ہوتے تھے آنکھوں کو الاؤ کے پرتو نے تارے سے بنا دیا تھا مجھے اُس روز معلوم ہوا کہ چغتائی کنوارا

کی آنکھیں بنانے میں کسی قسم کے مبالغے سے کام نہیں لیتا" ایسی کافر چشم لڑکیاں ریگستانوں کے دور دراز گوشوں میں ابھی تک بستی ہیں ۔۔۔ اور صبا بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔ ان آنکھوں کے سرمئی پپوٹوں کے ساتھ ساتھ لوٹی ہوئی نیند نے نمی کی دھاریں بنا دی تھیں۔ ناک ایسی تیکھی کہ یونانی بت تراشوں کے ذہن میں نہ آسکی ہوگی۔ اوپر کے ہونٹ میں ایک اعرابی خم کہہ رہا تھا "میں اَنچھوا ہوں مجھے سورج کی شعاعوں، تپتی ہوئی ہواؤں اور دوپٹے کے سوا کسی نے مس نہیں کیا۔ میں کسی جنسی لمس کا پیاسا نہیں ہوں۔ مجھے تپتی تپتی چھاؤں اور روکھے ساگ نے پالا پوسا ہے۔ میں شبنم کا محتاج نہیں ہوں۔ مجھے بوسے نہیں چاہئیں۔ بوسہ میری موت ہے۔ بوسہ مجھے پگھلا دے گا!" ۔۔۔ اور نچلا نسبتاً بھرا بھرا ہونٹ جیسے سیب کی اس پتلی سی قاش کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اور پھر ٹھوڑی پر اس کا غیر محسوس سا جھکاؤ ۔۔۔ اور پھر گردن کے مرمر کا تناؤ ۔۔۔ کاش انسان صرف لکھ سکتا یا صرف کہہ سکتا! خدا کی یہ فیروز بخششیں اسے اظہارِ عبودیت کی بجائے دیکھتا رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں صبا کے چہرے کے متعلق نہیں لکھ رہا، ایک پھول پر پردہ مکھیوں کا ڈھیر لگا رہا ہوں ۔۔۔ پھول ۔۔۔ ننھی سی ڈنڈی پر بیٹھی ہوئی سفید پنکھڑی اور تین پتے اس کے پہرہ دار ۔۔۔ میں نے بوڑھے، بڑھیا اور لڑکے کو دیکھ کر جی میں کہا "ایک ۔۔۔ دو ۔۔۔ تین!" ۔۔۔ اور اگر میں اس پھول کو چھو لوں!

چائے تیار ہو چکی تھی میں نے اصرار کیا ہم سب کو اکٹھے چائے پینا چاہیے مگر معلوم ہوا کہ گھر میں چینی کی صرف ایک پیالی ہے میں نے مٹی کے پیالوں کی تجویز پیش کی تو سب ہنسنے لگے صبا نے ہنستے ہنستے چہرے کو ہاتھوں [illegible] ۔۔۔ پیالے [illegible] ان کی چلمنوں کے پیچھے سیاہ پتلیاں ۔۔۔ ہوئی نیلمیں نگاہیں گر گئیں سے مٹی کے شیشوں پر مچل رہی تھی

ہیں اور آنکھ رہی ہیں ـــ ہمارے تمہارے درمیان اگر مغرب سے مستعار لئے ہوئے یہ بلوریں حجاب، حائل نہ ہوتے تو ہمارا آپس میں لپٹ جانا یقینی تھا!"

میں نے عینک اتار لی۔ تو بوڑھا بولا "آپ رات کو بھی عینک پہنتے ہیں؟"

میں نے چینی کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں میری آنکھیں بہت خراب ہیں۔"

"کیسے خراب ہوئیں جی؟" بڑھیا نے پوچھا۔

میں نے کہا: "بچپن میں پہاڑ سے سر کے بل گر پڑا تھا۔ اس سے میری تو پتلیاں پھیل گئیں تب سے عینک کی لت پڑ گئی۔ بڑی منحوس چیز ہے۔ اب میں بغیر اس کے کچھ بھی تو نہیں دیکھ سکتا۔"

بوڑھے نے پوچھا "فلکا نظر آ رہا ہے آپ کو؟"

"بس یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کھڑکی پڑی ہے!"

فلکا کھلکھلانے لگا۔

"اور صابی کو دیکھ سکتے ہیں آپ؟"

"ہاں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ـــ جیسے کوئی بیٹھی ہے جھیل کے کنارے۔"

بوڑھا جوڑا سنجیدہ سا ہو گیا۔ فلکے کی کھنک قہقہوں میں بدل گئی اور صابی نے جھانکر کو چٹاخ سے توڑتے ہوئے آہستہ سے کہا "آپ تو بالکل ـــ!"

"اندھے ہیں" میں نے گرہ لگائی۔

بوڑھا چونک کر بولا "نہیں نہیں جی صابی کچھ اور کہنے والی تھی"

"بھلا کیا کہنے والی تھی؟" میں نے صابی کی طرف دیکھا۔

صابی خوفزدہ سی نظر آنے لگی تھی۔ جھجک کر بولی "میں تو کہہ رہی تھی کہ آپ تو بالکل ـــ" وہ رک گئی۔

"اندھے ہیں!" میں نے کہا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ میری ہنسی نے انہیں

سہارا دیا تو بڑھیا بولی۔ داروغہ جی بالکل فرشتہ ہیں۔"

"میں یہی کہنے والی تھی" صابی جھٹ بول اٹھی۔

فرشتہ! ــــ میں نے سوچا ــــ کاش صابی مجھے انسان ہی سمجھتی۔ جو محسوس کر سکتا ہے، سوچ سکتا ہے، محبت کر سکتا ہے اور اگر تنہائی میسر آجائے تو اس کے حسن کی ایسی تعریف کر سکتا ہے کہ ان ریگستانوں میں کسی مرد نے کسی عورت کے متعلق ازل سے لیکر آج تک نہ کی ہوگی۔

جوانی کی راتیں [illegible] کے لئے ہوتی ہیں اور اگر ان سوچوں میں نیند دل کی ہلکی ہلکی گنگناہٹ بھی ہو تو کیا ہی کہنے! ــــ میں رات بھر سوچتا رہا۔ دیا اسی طرح جلتا رہا۔ صابی زرد اندھیرے میں ڈوبی رہی۔ فلکا داگمیں کھنچتا رہا۔ بڑھیا کی نیند موت کی حدوں کو چھو رہی تھی اور داروغہ صاحب بڑبڑا رہا تھا۔ نہ نہ۔ اکیلے تو کبھی نہ بھیجوں۔ ایسی ویران راتیں ہیں ــــ نہ نہ ــــ نہ نہ!" ــــ اور پھر کروٹ بدل کر بڑبڑاہٹ جاری کر دی۔ "فلکے کے ساتھ؟ کبھی نہیں نہ نہ ــــ نہ نہ"

دراصل مجھے اس روز معلوم ہوا کہ پھولوں کے علاوہ مجھے لڑکیاں بھی پسند ہیں اور پھر لڑکیاں کسے پسند نہیں لیکن میری پسند کا معیار عام دنیا سے کچھ الگ ہے میں گرچہ تمہارے شہروں کی سیلاب زدہ گلیوں اور طوفان بردوش بازاروں میں لڑکی ایسے لطیف وجود کو دیکھ کر اس سے محبت نہیں کر سکتا صرف ہمدردی کر سکتا ہوں۔ عورت جس کا ہیولیٰ تیار کرنے سے پہلے قدرت نے اپنے ہاتھوں میں رنگ دلاویز تزئین و تجمل کی لہریں دوڑائی ہونگی دھوآں دھار ماحول میں دیوانے ہجوم کے چنگل میں پھنس کر رہ جانے کے لائق نہیں۔ اسے وسیع مرغزاروں اور صحراؤں میں تاکہ وہ جدھر چاہے نکل جائے جب چاہے گھوم جائے رقص کرے پاؤں پسارے انگڑائی لے ــــ اور پھر جس انگڑائی کے پھیلاؤ کو تہذیب و تمدن کے سانچے محدود

کر دیں۔ اُسے انگڑائی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اُس کے لئے گلبلاہٹ کا لفظ موزوں رہے گا۔

مجھے عورتیں پسند ہیں، مگر اکیلی اور چپ چاپ! جن کی آنکھوں میں حیا ئیں چمک اور عمق پیدا کر دیں جن کے ہونٹوں کی شفق رنگ محرابوں میں سکوت سجدے کرے، جن کی باہوں میں لوچ ہو، لیکن لپکنے والا نہیں جھکنے اور سمٹنے والا۔ جو چلیں تو یوں معلوم ہو جیسے ساری کائنات خراماں ہو گئی ہے۔ جو مسکرائیں تو فضاؤں میں تارے بکھر جائیں، جو روٹھیں تو آسمان سمٹ کر محض ایک تل بن جائے۔

اچاٹ نیند ہر انسان کو شاعر بنا دیتی ہے اور پھر میں تو تھا بھی ایک خوابناک ماحول میں میٹالا دیا۔ مخروطی لَو جیسے جل بر رہی تالاب کنارے کھڑی بال سکھا رہی ہو کچی دیواریں اور اُن پر مٹی کے طاق۔ بھدی چینگیریں، بڑے بڑے چھاج۔ فرش پر پانچ کھاٹیں۔ ہر کھاٹ پر ایک ناتمام افسانہ دبکا ہوا۔ برسے ہوئے بادل کی مایوسانہ گرج بھیگی ہوئی ریت کی سوندھی سوندھی بو جو کواڑ کی جھریوں سے سرک کر اندر آرہی تھی۔

یہ جھری بھی عجیب بے ساختہ سی چیز ہے آپ ہی آپ پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اس کا وجود صحرائی گھروندوں کے کواڑوں تک ہی محدود نہیں۔ دماغوں میں بھی تو جھریاں ہوتی ہیں جہاں سے کائنات کے آغاز و انجام کے اسرار جھانکتے رہتے ہیں۔ دل کی بھی تو جھریاں ہوتی ہیں، جہاں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹتے ہیں جھری! ــــ کواڑوں کی جھریاں روشن ہو گئیں۔ روشن تر ہو گئیں ــــ جگمگانے لگیں ــــ کوندے سے بن گئیں ــــ اور پھر یہ کوندے اکٹھے ہو کر مجھ پر لپکے اور میرے کانوں میں آواز آئی۔ "داروغہ جی ــــ اٹھئے گا۔ صبح ہو گئی"۔

مجھے ایسا۔ نہایت گہرے کوئیں سے اچانک اوپر اچھال دیا گیا۔ بڑھاپے

پاس کھڑا تھا۔ کوٹھا خالی تھا۔ صحن میں دھوپ چمک رہی تھی۔ دیوار کے بالکل سامنے پشت سی کھجور پہ ایک لالی اپنے ننھے کو چوگا دے رہی تھی۔ اور باہر دودھ بلویا جا رہا تھا
"حضور"۔ بوڑھا کھاٹ کے قریب ہی زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا: "حضور ایک بات کہوں آپ سے۔"

"کہو۔ کہو"۔ میں نے معمول سے زیادہ اونچی آواز میں کہا۔ تاکہ صابی سن لے اور اسے معلوم ہو جائے کہ بھیگا ہوا مسافر دھوپ کے انتظار میں ہے۔

بوڑھے نے خشکی کا ایک گولا نگل کر کہا: "حضور میرا نام رنگا ہے۔"

"رنگا"۔ میں نے کہا۔ "اور اس جگہ کو کیا کہتے ہیں؟"

"بستی رنتیاں"۔ وہ بولا۔

"رنگا ــ بستی رنتیاں ــ تمہارے باپ کا نام بخشا تھا نا؟"

"حضور"

"میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ تم نے برسوں سے محکمہ کی قسطیں ادا نہیں کیں۔ ٹھیک ہے نا؟ تمہارے ذمے تین سو روپے ہیں۔ کیوں غلط کہا میں نے؟"

بوڑھا ہاتھ جوڑ کر بولا "جی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

"کیوں ادا نہیں کیں؟"

"غریب ہوں جی۔ بہت غریب ہوں۔ باپ دادا سنگھیانی سے اٹھ کر یہاں آ بسے تھے کہ کھلے میدان ہیں، کہیں کہیں ہل جوت کر زمینیں آباد کر لیں گے۔ کچھ کر بھی لیں ــ مگر برا ہو ان آندھیوں کا۔ بڑا پریشان کیا انھیں۔ اور پھر ان کی موت کے بعد تو ٹیلوں کے ٹیلے آ گرے ان پر۔ اب صاحب ٹیلے کون سمیٹے۔ ہوتے ہوتے یہ چند ٹکڑے رہ گئے ہیں۔ گاؤں جا بسیں، کمین بن کر رہیں۔ یہاں سوکھی سڑی جو ملتی ہے صبر شکر کر کے کھا لیتے ہیں۔ فلکا ابھی چھوٹا ہے۔ بڑھیا کام نہیں کر سکتی صابی ــ"

اچانک صابی اندر آ گئی۔ بوڑھا رک گیا۔ میں کھنکارا۔ صابی نے جوتیاں پہنیں اور بولی۔ "اب چلیں ابا؟"

بوڑھا بولا۔ "صابی اپنی خالہ کے ہاں جا رہی ہے۔ یہاں سے بیس کوس دور رہتی ہے اس کی لڑکی کی شادی ہے کل ہم کو بلا بھیجا۔ مگر صابی اور فلکے کے لئے تو دو تین سرا سی بھی بھولا چکی ہے پر صاحب آندھی طوفان کا کوئی اعتبار نہیں ڈرتا ہوں کوئی آفت آپڑی رستے پر، تو یہ کیا کریں گے جانا بھی ضرور ہے انہیں ورنہ اس کی خالہ --- توبہ --- مکی کا پکا ہوا بھٹہ ہے ذرا آنچ پہنچے اور چٹاک پٹاک ہو کے رہ جائے ری۔"

میں نے پوچھا "کیا نام ہے گاؤں کا؟"

بولا "شمس پور"

"نور کوٹ کے آس پاس ہے کہیں؟"

"نور کوٹ سے تین کوس پرے۔"

"مجھے بھی تو نور کوٹ ہی جانا ہے اور پھر آج ہی جانا ہے۔ صابی اور فلکا میرے ساتھ چلے چلیں۔"

میں نے صابی کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر شوخ رنگوں کا ہجوم سا ہو گیا بوڑھا بھی مسکرانے لگا۔ "یہ بڑی اچھی بات ہوئی۔ کیوں صابی؟"

اور صابی نے اپنی ٹھوڑی کو انگوٹھے سے رگڑ کر کہا۔ "جی ——— داروغہ جی تو بالکل ——— ے"

"ندھے ہیں" میں نے صابی کی بات اچک لی۔

بوڑھا یوں ہنسا جیسے چند بھیگے ہوئے پٹاخے ایک دم چھوٹ جائیں صابی بچارا کا نارہ منہ میں نے کر اور گردن موڑ کر مسکرانے لگی فلکا بھاگا آیا۔ بوڑھی بھی نکلی

آ ئی۔ اور آخر یہی فیصلہ ہوا کہ ہم ابھی چلیں۔ ورنہ رستے میں ہی رات آ جائے گی۔

"اور ـــــ" میں نے صابی کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اگرچہ میں تمہاری رپورٹ کرا آیا ہوں۔ مگر یہ جو تین سو روپے پاس نا۔ ان کا انتظام ہو جائے گا۔ تم بے فکر ہو۔ بس مجھے یہی جانو کہ تم نے ادا کر دیں تو ملیں!"

ہائے دہقانوں کا اظہارِ ممنونیت آنکھوں میں نمی، ہونٹوں پر مسکراہٹ ہاتھوں میں رعشہ، اور گلے میں بہت کچھ کہنے اور کچھ نہ کہہ سکنے کا پھندا، نرد مسرت سے بڑھیا بلبلا اٹھی۔ اور صابی نے آنچل سے آنکھیں صاف کر کے مجھے ایسی جاذبیت سے دیکھا کہ اگر میں خاکی نہ ہوتا تو نور کی ایک کرن بن کر اس کی ملتی ہوئی پتلیوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سما جاتا۔

میرے کپڑے آگ اور دھوپ پر خشک کئے گئے، پراٹھوں اور چھاچھ سے ناشتہ ہوا اور جب میں بالکل تیار ہو گیا تو بوڑھا مجھے ایک طرف لے گیا۔ "نور کوٹ تک بالکل سیدھی پگڈنڈی جاتی ہے مگر آج بارش نے پگڈنڈیاں مٹا دی ہوں گی پھر بھی کچھ نہ کچھ نشان نظر آئے گا آپ کو یہاں سے کوئی دس کوس پر ایک چھوٹی سی آبادی ہے کھجوریاں۔ وہاں سے ایک طرف ہو کر نکل جائیے گا۔ اصل میں وہاں ہمارے نمبر دار جبار رہتے ہیں۔ میدانوں میں بکھری ہوئی بستیاں انہیں کے پاس ہیں وہ صابی کے لئے بڑا عرصہ بات چیت کر چکے ہیں۔ پر میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ سنا ہے کچھ سوداگر قسم کے آدمی ہیں اور یہ سوداگر لوگ کنجوس ہوتے ہیں کنجوس۔ صابی بھر کے باپ کے گھر سے نکل کر کنجوس خاوند کے ہاں جا پھنسی تو گھل جائے گی بے چاری۔ سو ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا صابی کو سب کچھ معلوم ہے اس لئے ادھر سے گزرنا ٹھیک نہیں ـــــ بس یہی کہنا تھا ـــــ اور آپ نے مجھ غریب پر ــ"

"بس بس بابا" میں نے بوڑھے کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "رہنے دو یہ رسمی باتیں ہیں

تم سب اتنے اچھے ہو کہ میں تو کہتا ہوں، تور کوٹ چھوڑ کر یہیں اس چھوٹی سی بستی ریتاں میں ــــ ننھا سا گھروندا بنا لوں۔ چند بھیڑیں پال لوں۔ دن بھر انہیں چراؤں اور رات بھر تم سے کہانیاں سنوں مغلوں اور سکھوں کے زمانے کی۔"

بوڑھے جوڑے نے مجھے دعائیں دیں۔ صابی اور فلکا میرے ساتھ ہو لئے اور اب ہم تینوں مشرق کی سمت روانہ ہو گئے۔ قریب سے تو پگڈنڈی کا نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ مگر دور ایک کہکشاں سی جھلملاتی۔ اور ہم اسی کے سہارے چلتے گئے میں سب سے آگے جا رہا تھا۔ صابی اور فلکا گاہے گاہے کھسر پھسر کر لیتے تھے اور میں سوچتا جا رہا تھا کہ اس سفر کو دلچسپ کیسے بنایا جائے۔

دلچسپی صرف عورت سے عبارت ہے اور صابی شرمیلی تھی۔ فلکا بھولا بھالا اور مسافت طویل تھی۔ آخر ایک ٹیلے پر رک گئیں نے کہا۔ "فلکے لا تجھے اٹھا لوں کاندھے پر۔"

وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ "میں کوئی بچہ ہوں"۔ وہ بولا

میں نے کہا۔ "تو پھر اپنی بہن کو اٹھا لے۔ تھک گئی ہو گی بے چاری۔"

"میں کوئی گبرو ہوں!" ــــ وہ اور صابی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"تو پھر میں اٹھا لیتا ہوں صابی کو" میں نے کہا۔

اور صابی بل کھا گئی۔ غصے سے نہیں حیا سے! کیونکہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا" میں نے کہا۔ "سچ مچ تم دونوں میں سے ایک کو میں اپنے کاندھے پر بٹھا کر تمہیں چالیس میل تک چل سکتا ہوں۔"

وہ دونوں ہنستے جا رہے تھے اور دلچسپی پیدا ہو چلی تھی۔ اب ہم تینوں اکٹھے چل رہے تھے میں فلکا اور صابی۔ اچانک فلکا ایک۔۔ طرف لپکا۔ اور ایک پھول کو

زنڈی سمیت تیچھے لایا لیکن اب صابی میرے قریب ہو گئی تھی اور عورت پھول سے کہیں زیادہ مرغوب چیز ہے۔ فلکا پھول کو انگلیوں میں نچا رہا تھا اور ہم تینوں چلے جا رہے تھے۔ صابی میں اور فلکا!

ایک بار فلکے کا ہاتھ میرے ہاتھ سے ٹکرا گیا۔ میں ایک طرف ہٹا تو صابی کا ہاتھ میرے ہاتھ سے مس کر گیا اور وہ پرے ہٹ گئی۔ میں پھر فلکے کے قریب آ گیا۔ کافی دیر تک وہ پرے پرے رہی اور پھر فلکا بولا۔ "اری پگڈنڈی پر چل۔ ریت پر چلنے سے جلدی تھک جایا کرتے ہیں۔"

اُس نے میری طرف دیکھا۔ مسکرائی اور قریب آ گئی۔ ہمارے ہاتھ ایک بار پھر ٹکرائے اور جب فلکا ایک پھول توڑنے کیلئے دُور بھاگ گیا تو میں نے صابی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس نے پہلے تو انگلیوں کو کھینچا تانا۔ مگر پھر انہیں چھوڑ دیا۔ اُس کے ہاتھ گرم بھی تھے اور ٹھنڈے بھی۔ نرم بھی اور سخت بھی۔ ان میں دھڑکنیں بھی تھیں اور مدہوشیاں بھی۔ میں نے انہیں ٹٹولا۔ اور پھر صابی کی طرف دیکھا۔ وہ پگڈنڈی پر نظریں جمائے رہی۔ میں نے کہا۔ "صابی"

بولی "جی"

"میری طرف دیکھو"

"لیجئے"

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں"

"کچھ تو سوچ رہی ہو؟"

"اللہ قسم کچھ بھی نہیں۔"

"صابی — دیکھو —" کھولتا ہوا خون حلق پر بھی اثر انداز ہونے لگا۔

الفاظ کا ایک ہجوم لگ گیا وہاں۔ زبان تڑپنے لگی۔ کچھ کہنے کیلئے۔ مگر چند موزوں الفاظ کا انتخاب مشکل تھا اور پھر میں تو ہجوم میں بہت گھبرا جاتا ہوں!

"آپ کچھ کہہ رہے تھے"۔ اس نے میرے ہاتھ کو ٹٹولا۔

میں کہنے والا تھا کہ میں تمہارے ہاں مدتوں تک آتا رہوں گا۔ سمجھیں؟ مدتوں تک۔"

"لیکن ——" وہ رک گئی۔ فلکا پھولوں کا ایک گچھا لئے ہمارے قریب آ گیا تھا اور جب نمبردار کی بستی کی جھوریاں سامنے نظر آئیں۔ تو مجھے شرارت سوجھی میں نے ادھر ہی کا رخ کیا۔ تھوڑی دور چل کر صابی رک گئی اور بولی۔ "راستہ ادھر جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مگر پگڈنڈی تو سیدھی اس آبادی میں گھستی معلوم ہوتی ہے۔"

"یہ غلط راستہ ہے۔" وہ بولی

فلکا تڑپ اٹھا۔ "ارے یہ سامنے تو ہے راستہ وہ جا رہا ہے اور پھر وہ —— وہ ——وہ!"

صابی نے اس کی اٹھی ہوئی انگلی کو پکڑتے ہوئے کہا۔ "تم اندھے ہو۔"

"کون؟" میں نے عینک اتار لی۔

صابی ہنسی۔ یہ ہنسی بے ساختہ تھی۔ اس میں تاروں کی ٹمٹماہٹیں نہ تھیں۔ چاندنی کا ہمہ گیر پھیلاؤ تھا۔ فلکا کو مخاطب کر کے بولی۔ "دیکھ رہے وہ —— وہ اونچے ٹیلے کے ایک طرف سے ہوتی ہوئی پگڈنڈی —— وہ جھکی ہوئی کھجور کے نیچے —— اور وہ بلکھتی ہوئی کمان کی طرح۔"

فلکا آنکھیں مل کر بولا۔ "مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا!"

صابی بولی۔ "اندھا"

"کون؟" میں نے عینک چڑھالی۔

اور وہ زور زور سے ہنستی ہوئی بولی "چلئے نا۔ ادھر سے چلئے۔ اُدھر آبادی ہے، بڑے بڑے کتے ہیں ــــــ"

"اور وہ کھجوروں کے جھنڈ ہیں" میں نے کہا "جن کے سائے میں تھکے ماندے مسافر گھڑی بھر کے لئے سستا سکتے ہیں!" اور صابی ــــ مجھے کھجوریں بہت پسند ہیں یہ ریگستانی چھتریاں!"

لیکن اُس نے مجھے ہاتھ سے کھینچ کر دوسری راہ پر ڈال دیا۔ ریت میں ہمارے پاؤں دھنس جاتے تو فلکا پکار اٹھتا "اب تمہا کہاں ہے پگڈنڈی؟"

"یہ" وہ کہتی "یہ جا رہی ہے ۔ وہ جا رہی ہے"

"کہاں جا رہی ہے؟"

"شمش پور جا رہی ہے"

"کلے پالی جا رہی ہے"

اور اس طرح ہنستے ہنساتے ایک دوسرے کا سہارا لیتے ہم کھجوریاں کو ایک طرف چھوڑ کر پھر اصل راستے پر آ گئے۔ اب پگڈنڈی خوب اُبھر آئی تھی کیونکہ اس علاقے میں بارش نہیں ہوئی تھی۔

ایک بار بڑی رد و کد کے بعد میں نے فلکے کو کاندھے پر بٹھا لیا۔ کچھ دور جا کر وہ چیخنے لگا "بس جی بس۔ اب میں پیدل چلوں گا۔ مجھے اتار دیجیے۔"

"اچھا" اسے اتار کر میں نے صابی سے کہا "صابی تم بھی تھک گئی ہوگی؟"

"جی تھک تو گئی ہوں۔" وہ بولی۔

"تو پھر میرا سہارا لے لو"

"کب تک سہارا لوں؟"

"جب تک چاہو"
"کب تک چاہوں"
"جب تک جی چاہے"
"جی تو چاہتا ہے ۔۔۔ "لیکن یہاں فلسفا بول پڑا "صابی تو پاگل ہے"
اُس نے مسکرا کر عالمکے ہلکی سی چپت جمائی اور پھر میرے کاندھے پر بازو رکھ دیا۔ نور کوٹ تک میری سماعت اتنی تیز ہو گئی، کہ میں نے اُس کے دل کی دھڑکن سن لی۔ بصارت اتنی تیز ہو گئی کہ میں نے اُس کے خیالوں کو پڑھ لیا محبت اتنی تیز ہو گئی کہ میں استعفا پیش کرنے کے متعلق سوچتا رہا۔

جب ہم نور کوٹ پہنچے تو شام ہو چکی تھی میں نے انھیں اپنا مکان دکھایا۔ سنترے کھلائے رات وہیں بسر کرنے کو کہا۔ مگر وہ نہ مانے۔ میں نے شمس پور ساتھ چلنے کو کہا۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ البتہ یہ وعدہ کر لیا کہ وہ واپسی پر مجھ سے ملتے چلیں گے

میرے لئے یہی بہت تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں صرف ایک ستارے کی ٹمٹماہٹ ہی مسافر کا سہارا بن جاتی ہے

پرواز

محبت کے متعلق میں نے اس سے قبل بھی بہت کچھ سوچا تھا لیکن جب سچائی سوچ سے ٹکراتی ہے تو پرانے نقوش پر سیاہ برش پھیر دینا پڑتا ہے اب مجھے تجربہ ہوا کہ محبت میں نیند بھی آ سکتی ہے چاندنی راتوں کی بجلے اندھیرے کمرے بھی پسند آ سکتے ہیں محبت ماحول کی پیداوار نہیں یہ تو جی کی

طرح بالکل بے ساختہ سی چیز ہے یہ تو اتفاقات کا معجزہ ہے میں نے ہزار کوشش کی کہ صابی کا روشن چہرہ اندھیرے بال اور بھرا بھرا لباس سامنے دیوار پر نہ ابھرے۔ لیکن وہ ابھرتا ہی رہا کئی بار اس کے خطوط بہت واضح ہو گئے اس خیال کو بھلانے کے لئے کئی بار میں نے چھت سے مکڑی کے جالے اتارے۔ سنترے کے چھلکوں کو موڑ توڑ کر پھواریں پیدا کیں۔ ایک بار چھت پر چڑھ گیا۔ نور کوٹ سو رہا تھا آسمان پر جگہ جگہ بدلیوں کے پیوند لگے ہوئے تھے اور ہوائیں کروٹیں لے رہی تھی!

دیر تک میں وہیں چھت پر بیٹھا رہا نیچے آیا تو ایک پرانا اخبار اٹھا لیا۔ روس اور اٹلی میں اتحادی یلغاروں کی خبریں جلی سرخیوں میں لکھی ہوئی تھیں۔ میں جلتے ہوئے شہروں کا تصور کرتا رہا۔ ذہن نے بمباری کے نظارے پیدا کرنے کی سعی بھی کی۔ بھاگتی ہوئی مخلوق جگہ جگہ سے جلد چیتھڑوں کی طرح لٹکتی ہوئی بچے خوف سے دم بخود عورتیں چلاتی ہوئی ادھ ننگی عورتیں کھلے بال دودھ سے بھری ہوئی چھاتیاں اپنے بچوں کو گٹھڑی کی طرح گھسٹتی اور پیٹتی ہوئی عورتیں پناہ گاہوں کی طرف لپکتی ہوئی ۔۔۔ اچانک ان عورتوں میں مجھے صابی نظر آ گئی اور میں گھبرا کر دوسرے کالم پر جھپٹا۔

یہ کلکتہ کے بھوکوں کی مختصر سی خبر تھی چند پٹڑیوں پر مردہ پائے گئے، چند اسپتال میں داخل کر دئے گئے، چند خاکساروں کے حصوں میں آئے، چند انجمنوں کے ہتے چڑھے، اب تک اتنے لاکھ مر چکے ہیں اتنے ہزار ہسپتال میں ہیں، اتنے ہزار لنگر کھولے گئے ہیں، جن میں اتنے لاکھ بھوکوں کو چاول دیئے جاتے ہیں ایک لڑکا اور ایک کتا ڈبل روٹی کے ایک ٹکڑے پر لڑ پڑے۔ ایک عورت تار کے کھمبے سے ٹیک لگائے بیٹھی دیکھی گئی اور جب اُسے بلایا گیا تو وہ ایک طرف گر گئی۔ اور اس کی اغل سے اُس کا سوکھا ہوا بچہ بہت مشکل سے الگ کیا گیا کیونکہ مرنے

کے بعد بھی اُس نے ماں کی چھاتی کو منہ میں لے رکھا تھا۔

یہ عورت بھی صابی بن گئی۔ جانے ہر عورت، صابی کا روپ کیوں دھار لیتی تھی اور اگر صابی واقعی کلکتہ میں ہوتی تو کیا کرتا میں! خود خاک چاٹتا پر اُسے بھوکا نہ مرنے دیتا۔۔۔ مگر وہ طوفانِ نوح والی ماں جس نے اپنے منہ میں پانی جاتا دیکھ کر اپنے ننھے کو پاؤں تلے دھر دیا تھا تاکہ زندگی کا رشتہ ذرا دیر تک رہ سکے!۔۔۔ ہائے، یہ زندگی کی قلابازیاں کھاتی حقیقتیں۔۔۔ کیا بنگال کی ہر مرنے والی کسی نہ کسی کی صابی نہیں ہوتی!۔۔۔ گیا بنگال کے مرد ایسے ہی بے غیرت ہیں کہ اپنی محبوبوں کو مرنے دیتے ہیں۔۔۔ اپنی آنکھوں کے سامنے۔۔۔ انہیں چھوڑ کر آگے چل دیتے ہیں اُن کو بیچ ڈالتے ہیں۔

رفعتاً میرے خیالوں میں کوئی چیخا: "تو بنگال سے دور بیٹھا ہے، تو پنجاب میں ہے جہاں گندم کی افراط ہے، تو ان ماؤں کو نہیں دیکھ سکتا جو اپنے ننھوں کو چجرنی کے بدلے بیچ ڈالتی ہیں اور اس چجرنی سے باسی ڈبل روٹی کا ایک لقمہ خرید کر نگل لیتی ہے تو کلکتہ میں نہیں نور کوٹ میں ہے۔"

نور کوٹ۔۔۔ جو شمش پور سے صرف تین کوس نزدیک ہے، اور پھر صابی میرے حواس پر چھا گئی اُسی روز سے مجھے لڑکیوں کے دیکھنے کا شوق بھی ہو گیا۔ اور شاید اسی لئے دوسرے روز شام کو پڑوس کے باورچی خانے کے دروازے پر بوری کا ایک ٹکڑا لٹکا دیا گیا۔

تیسرے روز دوپہر کے قریب کسی نے حویلی کے دروازے پر دستک دی۔ صحن عبور کر کے جب میں نے کنڈی کھولی، تو فلکا گلی کے پرلے سرے پر چپ چاپ کھڑا تھا "صابی کہاں ہے؟" میں نے اُس کے پاس جا کر پوچھا۔

"مر گئی" وہ بسورتے ہوئے بولا۔

"مر گئی ہے" میں نے فلکے کا بازو اس زور سے پکڑا، کہ اگر وہ صحرائی نہ ہوتا تو چیخ کر بے ہوش ہو جاتا۔

بیٹھی ہوئی آواز میں بولا "آپ نے سنا ہوگا۔ مہندی کی وجہ سے سردی لگ جائے، تو لوگ مر جاتے ہیں بس اُسے بھی سردی لگ گئی۔ شام کو سردی لگی، رات کو بے ہوش ہو گئی، صبح کو چل بسی۔ کہتی تھی، میری قبر پر ایک کھجور ضرور لگانا ورنہ اگلی دنیا میں کوستے دیتی رہونگی سب کو۔"

میں فلکے کو گلے سے لپٹا کر صحن عبور کر کے اپنے کمرے میں آگیا۔

صابی، سامنے پلنگ پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ آنکھیں جھپکائے بغیر بولی۔

"ہمیں چھیڑیے نہیں، ہم مر چکے ہیں۔"

اور پھر اچانک فلکا اور وہ مل کر اس زور سے ہنسے کہ میں گھبرا گیا۔

"تمہارا مذاق کامیاب رہا" میں نے کھسیانہ ہو کر کہا۔ "بہت چوٹ کہیں کی میں تو رو دیا تھا۔"

"میں بھی تو بہانے بہانے رو دیا تھا" فلکا بولا۔

اور صابی کہنے لگی "ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے میری آنکھوں میں بھی پانی آگیا ہے"

اُس نے ہاتھوں میں مہندی رچا رکھی تھی ہونٹ دنداسے سے سُرخ تھے بال عجیب اُلجھے ہوئے انداز میں گوندھے گئے تھے۔ کپڑوں پر جگہ جگہ شوربے کے دھبے تھے۔ اور اوڑھنی کا ایک پلّو جلا ہوا تھا۔

"یہ کیسے جلا؟" میں نے پوچھا۔

"شادیوں میں ایسا ہی ہوتا ہے" وہ مسکرا کر بولی۔ اور پھر چلنے کی اجازت چاہی، میں نے کہا "میں تو تمہیں دو تین روز یہیں رکھونگا۔ بستی ریتیاں میں تم نے

میری اتنی خاطر کی۔ اور اب میں تمہیں ... نے دیا یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں
دروازے پر پستول لے کر بیٹھ جاؤں گا۔ ہاں!"
صابی کے اصرار کیا۔ "یا پہلے سے ناراض ہو نگے۔ ہمیں کل شام کو آ جانا چاہئے تھا
اور اگر آج بھی نہ پہنچے تو سر اٹھا لیں گے اور آ کر ہم دونوں کی وہ گت بنائیں گے
کہ ... یہ فلکے سے پوچھئے"
فلکا بولا۔ "ابا مارتے ہیں، تو یوں مارتے ہیں جیسے ریت سے بھری ہوئی
بوری کوٹی جائے۔ بڑا غصہ ہے ان کا۔ ایک بار تو انہوں نے
"ہاں ہاں" صابی نے بات کاٹ دی۔ "ایک بار انہوں نے غصے میں آ کر
پاس ہی پڑا ہوا گھڑا توڑ دیا۔ پانی دڑ دڑ بہا تو اور گھبرا گئے اور فلکے کے وہ چپت
جمائی کہ یہ چار دن تک بائیں کان سے بہرہ رہا۔"
"اور پانچویں روز چپت غصے سے آئی آپ کھل گیا کان۔" فلکا بولا۔ "اس وقت ابا کا
غصہ اترا ہوا تھا میں نے کہا۔ "میرا کان کھل گیا۔" "کھل گیا؟" وہ بولے اور اس
خوشی میں گڑ تقسیم کیا گیا۔"
لیکن میں نے فلکے کو گراموفون باجے اور مٹھائیوں کا لالچ دیا۔ صابی سے نئے
نئے کپڑوں کا وعدہ کیا دھمکی دی۔ ہاتھ جوڑے اور آخر وہ مان گئے۔
میں نے نمبردار کے گھر اچھے اچھے کھانوں کے لئے کہلا بھیجا۔ بہت دیر تک
ہم بستی ریتاں اور لاہور کی باتیں کرتے رہے۔ شام کو ہم تینوں نے اکٹھے کھانا کھایا
اور جب رات ہوئی تو برآمدے میں بستر بچھا لئے گئے۔ فلکا گراموفون سن کر
سو گیا۔ تو میں صابی کے قریب گیا۔ وہ لحاف اوڑھے سونے کا بہانہ کر رہی تھی "آدم!"
میں نے خوفناک آواز نکالی۔
"ہائے اللہ" اس نے لحاف کو دور پھینک دیا اور مسکرا کر اٹھ بیٹھی۔ میں

نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور ہم دونوں باہر صحن میں آ گئے۔

میں نے اُس سے بہت باتیں کیں۔ پہلے تو سستے ناولوں کے مکالمے جو تحت الشعور میں دبکے ہوئے تھے اُبھرے اور میری زبان کترنی کی طرح چلتی رہی، یہ ذخیرہ ختم ہوا تو میں خود شاعر بن گیا۔ "صابی، تم صرف ایک بھولی بھالی صحرائی دوشیزہ ہی نہیں، تم ساحرہ بھی ہو۔ جانتی ہو ساحرہ کسے کہتے ہیں؟ ۔۔۔ جادوگرنی ۔۔۔ جادوگرنیاں اچھی بھی ہوتی ہیں اور بُری بھی۔ تم اچھی جادوگرنی ہو تم نے محبت کا منتر پھونک کر میری زندگی کو بالکل جھنجھوڑ دیا ہے۔ آج مجھے تارے زیادہ نظر آتے ہیں، ہواؤں میں نشے ہیں۔ اندھیرے میں بستر کی سی ملائمت ہے، میرے سامنے برآمدے کا ٹوٹا ہوا چھجا دیکھتی ہو نا۔ یہ مجھے ہمیشہ بُرا لگتا تھا لیکن آج یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اسے یوں ہونا چاہیے تھا اس کے بغیر عمارت مکمل نہ ہو سکتی ۔۔۔ صابی ۔۔ یہ ۔ تمہارا بادر ہے ۔۔۔ تم بہت دور سے آئی ہو، اور بہت دور چلی جاؤ گی۔ تم ہواؤں کی ہرنی ہو، جانے اس سے بھی دور نکل جاؤ کہیں۔ لیکن خدا کے لیے ایسی چوکڑی نہ بھرنا کہ میرے لیے خواب بنکر رہ جاؤ، تم نے مجھے موہ لیا ہے تمہارے ان بالوں نے ۔۔۔ ان آنکھوں نے جن میں حیا ہے اور محبت ہے، اور گہرائی ہے ۔۔۔ اور پھر سب سے زیادہ تمہاری معصومیت ۔۔۔ جانتی ہو معصومیت کا مطلب ہے یعنی سادگی صو لیکن تم کتنی سادہ ہو۔ کتنی بھولی ہو تم۔ صابی کیا تمہارے دل میں کبھی کسی مو ت کرنے کا خیال نہیں آیا؟"

"اُدھنک" وہ میرے شانے سے لگ کر بولی۔

"کبھی؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی نہیں۔ آپ کی قسم کبھی نہیں۔ اور وہاں بستی ریتاں میں کوئی گبرو ہے

ئی کب ـــ آپ ہی تو آئے کتنے برسوں کے بعد!"

وہ میرے اور قریب سمٹ آئی میں اُسے اندر کمرے میں لے گیا۔ لالٹین جل رہی تھی اور فلکا باہر برآمدے میں سو رہا تھا۔

میں لالٹین اٹھا کر اس کے قریب لے آیا۔ اور اسے غور سے دیکھ کر بولا۔ "اُف۔ صابی، بہت خوبصورت ہو تم۔ انسان کو اتنا خوبصورت بنا کر خدا اپنے لیے کیا چھوڑتا ہے!"

وہ مسکرا دی۔ لالٹین کو فرش پر رکھ کر میں جھکا اُس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیے (بھینچ دیں) اور مجھ سے لپٹ گئی۔ روس کی جنگ اور بنگال کا قحط اور اکیلا پھول ـــ میں سب کچھ بھول گیا۔ فلاکے کو بھی بھول گیا۔ میں نے صابی کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ یوں رکھے جیسے کانچ کی چوڑی = ! رکھی جاتی ہے۔ میں کھلے دروازے کو بھی بھول گیا میں نے صابی کے گالوں سے اپنے گال ملے۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے میں نے صابی کی ایک مینڈھی کو کھولتے ہوئے کہا "جیسے بالوں کی [illegible] ہے مجھے تمہارے شانوں پر تمہارے بالوں کا ایک ڈھیر سا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے میں کھیلوں گا ان سے!"

وہ ہنس پڑی اور دوسری مینڈھی کو خود ہی کھولنے لگی۔

اور پھر ایک دھماکا ہوا۔ اور چھت اور فضا اور آسمان ـــ سب میں ایک دراڑ سی پیدا ہو گئی۔

رنگا ایک بڑی سی لٹھ تھامے دہلیز پر قدم رکھ رہا تھا

صابی تڑپ کر وہ جا گری اور میرے دماغ میں ایسی کھلبلی مچی، جیسے چینی کے بہت سے برتن ایک ساتھ گر کر چکنا چور ہو جائیں۔

اُفتاد

بڑھے گرداس نے صابی کو ادھ کھلی پنڈلی سے پکڑ لیا۔ اور گھما کر
اس زور سے دیوار پر پھینکا کہ ایک لمحے کے لیے وہ تو اس باختہ ہو گئی۔ اور ہاتھوں
کو فرش پر رگڑنے لگی۔ فرداس دھماکے سے چونک کر دنبر پر آ نکلا تھا
اور دروازے سے چمٹ گیا تھا میں پلنگ پر بے حس و حرکت بیٹھا رہ
گیا۔ بوڑھا میری طرف بڑھا اور بولا۔ "ہم دہقان لوگ سوداگری نہیں
جانتے میاں۔۔ زمین زر کردوں کے بدلے ـــــــــ
مجھے اپنی ناک کٹوانا منظور نہیں ہے۔ ہاں تو اس وقت تمہاری کھوپڑی کے دو
کر کے رکھ دوں، پر دیکھ رہا ہوں کہ تم ہانپ اور کانپ رہے ہو۔ اگر جوانی نے
تمہیں ایسا ہی ندیدہ بنا دیا ہے تو لاہور کا ٹکٹ لو اور رنڈیوں کے پاس جا کر
پیاس بجھا لو۔ یہ ایک بوڑھے کی آبرو کے درپے ہونا تو بڑی ناہلیٹی کی بات ہے۔ میر اپنے
آپ کو پتا! کہتا تھا کہ اب پتہ چلا ہے کہ شہر سے دھوکا بھی دے جاتے ہیں۔
تم کتنے بھولے بھالے دکھتے تھے۔ اس رات کو میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ مجھے
نہ تمہاری افسری کا ڈر ہے نہ اپنی قسمت کا۔ ہاں کانوں میں آئے ڈگر اندر رو۔ مجھے تمہاری
دستگیری نہیں چاہیئے میں ریت پھانک سکتا ہوں سونے کے گولے نہیں نگل
سکتا۔ میں نے صابی کو کتنی بار کہا تھا کہ کمبخت شہر ان ریل اور لاری پہنچ گئی وہاں
چال چلن کا ستیاناس ہو گیا۔ اس کی ماں ٹھیک کہتی تھی۔ لڑکی نیند میں مسکرانے
لگے تو اسے کسی کے پلے باندھ دو ورنہ تل ٹکلاں کوئی گل کھلا بیٹھے گی۔"
پھر بڑھے کو صابی کو اٹھایا اور اسے دھکا دے کر بولا۔ "چل میرے ساتھ
کتنی بار قلکا تو پہلے ہی چیلا پہنے تیر اٹھرا تھا سبھی بوڑھی صابی سر جھکائے

باپ کے ساتھ محلی دروازے میں سے گذرتے ہوئے بوڑھا پلٹ کر بولا "اگر پھر کبھی بستی ہریتاں کا رخ کیا تو الٹا لٹکا دوں گا داروغہ جی کو ۔۔۔ ہاں!"

میں پلنگ پر بت بنا بیٹھا تھا۔ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ میرا دماغ دیر تک اس سانحہ کی تفصیلات میں ٹامک ٹوئیے مارتا پھرا اور جب مجھے احساس ہوا کہ میری نوخیز محبت کے پر اڑنے سے پہلے کتر ڈالے گئے ہیں تو میں نے اپنے چار طرف بڑی دردناک ویرانی محسوس کی، اچانک میری پنڈلی کو جیسے بچھو نے کاٹ لیا میں تڑپ کر اٹھا۔ شلوار کا پائنچہ لالٹین پر دیر تک پڑے رہنے سے سلگ اٹھا تھا۔ میں نے تیزی سے اُسے اپنے ہاتھوں میں مل ڈالا۔ اور جب پڑوس سے مجھے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز آئی تو میں نے چاہا اپنے کالے ہاتھوں کو چہرے پر مل کر نور کورٹ کے گلی کوچوں میں نکل جاؤں اور اپنے آپ کو کتوں سے نچوا ڈالوں ۔۔۔ لیکن پھر اچانک خیال آیا کہ شادیوں میں ایسا ہی ہوتا ہے"

عشق و محبت کی داستانوں میں میں نے عشق و محبت کے راز اتنی تیزی سے افشا ہوتے نہیں دیکھے۔ محبت ہوتی ہے پینگیں بڑھتی ہیں طویل ملاقاتیں ہوتی ہیں جب کہیں جا کر کسی کے کانوں میں سماجی دنیا کے اس سانحہ عظیم کی بھنک پڑتی ہے ہولے ہولے یہ آگ سلگتی ہے اور مدتوں تک بھڑکتی رہتی ہے اس کے شعلوں کے بہت زیادہ بلند ہونے سے پہلے جوانیاں ڈھل جاتی ہیں، اور بوسے بے رس ہو جاتے ہیں یہاں تو سلگنے اور بھڑکنے کے درمیان محض ایک بوسے کا وقفہ تھا اور وہ بھی ایسا مدہوش کن کہ اُس کا آغاز اور انجام یکجان معلوم ہوتے تھے۔

مجھے کھلے ہوئے پھول پسند ہیں بند کچھ نہیں مجھے وہ دوشیزائیں پسند

ہیں جن پر اخلاق کا پہرہ نہیں ہوتا۔ مجھے وہ مجبوریاں پسند ہیں جن کا حل ہر راہی حاصل کر سکے، پابندیوں سے مجھے نفرت ہے۔ قانون سے مجھے چڑ ہے محبت نہ کرو۔۔۔ یہ بھی خواب رہی۔ یعنی جیسے محبت کی جاتی ہے اس کے ہو جانے کا تجربہ کسی قانون ساز یا مبلغ کو نہیں ہوا۔

مجھ جیسا لاابالی انسان ان یکے بعد دیگرے بہت سے انقلاب سے بوکھلا گیا طبیعت پر ضبط کرنے کی بڑی کوششیں کیں۔ تور کوٹ کے رئیسوں کی محفلوں میں حصہ لئے اور فراموشی پر دیر تک عالمانہ بحثیں کیں حکیمانہ کاموں میں انہماک پیدا کرنے کی سعی کی، ذہن ایک مرتبہ پھر بانسری، موسیقی اور رقص کی طرف جھکا لیکن یہ سب وقتی ابال تھا۔ ٹھنڈا ہو جانے پر شعور عود کر آیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ بوڑھا بے قصور ہے۔ صابی مجبور ہے۔ اور میں اگر تین سو روپے کے وعدے کو خفض غیور بوڑھے کی محبت دشمنی اور جذبات کشی کے غصے میں بھول بیٹھوں تو میں بڑا پست ذہنیت کا انسان ہوں۔

ہوتے ہوتے صابی کی محبت نامرادیوں کے ملبے کو ہٹا کر ابھرنے لگی اور میں سوچنے لگا کہ جب یہ دہقان لوگ پیسے کے بدلے جھوٹی گواہی دے سکتے ہیں، موروثی زمینیں بیچ سکتے ہیں تو آخر وہ اپنی ان لڑکیوں کا سودا کیسے نہیں کر سکتے جنہیں بہرحال کسی سوداگر کے چنگل میں پھنسنا ہے البتہ شرط یہ ہے کہ سوداگر سلیقے والا ہو۔

اب سلیقے کا تقاضا یہی تھا کہ میں سب سے اول آورنگا کی قسطیں چکا دوں، اور اس کے بعد اسے کہلواؤں اور کہوں، کہ دنیا فانی ہے، صابی جوان ہے اور میں سرکاری عہدے دار ہوں، صاف بات ہے اس میں کوئی گتھی تو ہے نہیں میں نے سنگوان کے ذیلدار کو لکھ دیا کہ فلاں تاریخ کو تمام آسامیاں۔

سنگجانی میں موجود رہیں۔ ادھر نور کوٹ کے نمبردار سے تین سو روپئے چار پتاّ لیے جن کی پوٹلی باندھ کر میں نے مستقبل کے ایوان تراشے اور ان میں قسم قسم کی تصویریں آویزاں کر کے سنگجانی کی راہ لی۔

اُس روز بھی فضا میں سپید بادلوں کے گالے اڑ رہے تھے اور ابابیلیں سیاہ ہلالوں کی طرح فضا میں دائرے بنتی بکھر رہی تھیں۔ لیکن نہ مجھے سکوت کا احساس ہوا۔ نہ تنہائی کا۔ نہ میں اکیلے پھول پر جھا نہ تنہا کھجوروں پر۔ فضا آغوش نہ بن سکی۔ ٹیلوں پر اپنے قدموں کے نقوش دیکھ کر میں نے یوں محسوس کیا جیسے مادر گیتی کے ماتھے پر لغتیں لکھ رہا ہوں۔ بہت پرے اتر کی طرف کھجوریال کا ایک دھبہ سا دیر تک نظر آتا رہا لیکن اس دھبے نے کوئی واضح خط و خال اختیار نہ کئے اور جب سنگجانی کے پہرہ دار کوّے میرے سر پر سے چلاتے ہوئے گذرے تو میرے کانوں میں اذان کی آواز آئی ––– "موذن بوڑھا ہے" میں نے سوچا اور مسجد کہیں نشیب میں ہے اسی لئے تو آواز سے وجدان کو کوئی حرکت نہیں ہوتی۔"

سنگجانی کی پہلی گلی میں کتے کیتلے نے میرا استقبال کیا۔ مجھے لال لال آنکھوں سے گھور کر غرائے اور پھر منہ ملال کر یوں بڑبڑائے، جیسے کہہ رہے ہوں جانے دو، کوئی لفنگا معلوم ہوتا ہے ہم اپنا درمان کیوں خراب کریں۔"

قسطیں ادا کرنے والی آسامیاں جمع تھیں میں نے ہر ایک کو الگ الگ اندر کمرے میں بلانا شروع کیا اور آخر میں چوکیدار سے کہا۔ "زنگا ولد بخشا ذات اعوان سکنہ بستی ریتاں۔"

چوکیدار باہر نکل کر چلایا۔ "زنگا ولد بخشا ذات ––– دو رک گیا۔ بوڑھا کا آگے بڑھا اور بولا۔ "سلام۔"

میں نے محض اُسے تنگ کرنے کے لئے کہا۔ "روپے لائے؟"
چلمن سے ایک تھیلی میرے سامنے رکھ دی اور بولا "ہاں گن لو۔"
میری پوٹلی میرے کورٹ کی جیب میں مجبوس چوہے کی طرح پھڑکنے لگی میں نے پوچھا۔ "کہاں سے لئے؟"
بولا "جہاں سے بھی لئے تمہیں اپنے کام سے مطلب ہے؟"
میں نے کہا۔ "پوٹلی اٹھالو۔ تمہاری قسطیں ادا ہو چکیں۔"
"کیسے؟" اس نے پوچھا۔
"بس میں نے وصول کر لی ہیں۔" میں نے اُس کی پوٹلی کو پرے کھسکا کر کہا۔ لیکن وہ جاتے ہوئے بولا۔ "پر جو قسطیں ادا ہو چکی ہیں وہ میں نے ادا نہیں کیں اس رقم سے جو چاہو کرو، میرا حساب بے باق ہوا۔ سلام" اور وہ حیرت زدہ چوکیدار کے ایک طرف سے ہو کر باہر چلا گیا
چوکیدار بولا۔ "یہ کیا دار وغہ جی؟"
میں نے کہا۔ "بکواس بند کرو۔"
میں سنگجانی سے نکل کر بھٹک گیا ہوں۔ پریشانی میں بھٹک جانا ہی سب سے بڑی تسلی ہے۔ میں سوئے ہوئے ٹیلوں کی لہروں کو مٹاتا ہوں خشک ببولی کے ڈھانچوں پر ہنستا ہوں۔ کھجوروں کے کھردرے بدنوں پر ہاتھ رگڑتا ہوں، گاتا ہوں کہ فضا بیدار ہو جائے، روتا ہوں کہ ہوا بھیگ جائے، چیختا ہوں کہ سنسان پہنائیوں میں کھلبلی مچ جائے۔
ننگے رستے میں ایک پھول ملتا ہے میں اُسے نوچ کر ہوا میں اڑا دیتا ہوں اور جب وہ نیچے گرنے لگتا ہے تو میں بوٹ کی ٹو سے اس کو پھر اوپر اچھال دیتا ہوں بادل برف کے تودوں کی طرح ہوا میں جم گئے ہیں ابابیلوں کی اڑانوں میں

تھکن ہے جیسے وہ ابھی پر سمیٹ کر دھپ سے گر پڑیں گی۔ سکوت میں ماتم ہے۔ زمین کا یہ بیکار قطعہ۔ مجھے اُن گنواروں کی طرح معلوم ہوتا ہے، جو آداب و اخلاق سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ گنوار کا تصور زنگا میں بدل جاتا ہے۔ زنگا کا سایہ پھیلتا ہے اور دور ایک مٹیالا سا بادل بن جاتا ہے ——— یہ موضع کھجوریاں ہے!

میں کھجوریاں کی اُس پگڈنڈی پر بھٹک جاتا ہوں، جدھر سے صابی نہ گذر سکی۔ کھجوروں کے جھنڈ میں مجھے صابی نظر آجاتی ہے کانوں میں بندوں کی جگہ بالیاں ہیں۔ ناک میں کیل کی جگہ لونگ ہے، آنکھوں میں حیا کی جگہ دعوت ہے ذلکہ کھجور کے ایک درخت پر ہے اور صابی کی جھولی لال لال کھجوروں سے بھری ہوئی ہے۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھیں بھی لال لال کھجوریں بن جاتی ہیں اور گال بھی!

میں کہتا ہوں، "تم یہاں؟"

وہ کہتی ہے "ہاں۔"

میں پوچھتا ہوں: "کیسے؟"

وہ کہتی ہے: "تین سو روپے کے بدلے۔"

میں نے صرف اُس روز محسوس کیا کہ "کائنات لٹو کی طرح گھومتی ہے"

میں حواس باختہ ہو جاتا ہوں۔ میں بڑبڑاتا ہوں: "ستارے مر گئے ہیں، فرشتوں کو کانی کہانیاں سنانے والا رخصت ہے۔ چاند کے چیچک نکل آئی ہے۔ آسمان کا گریبان پھٹا پڑا ہے۔"

وہ کہتی ہے "ہوش میں آؤ۔"

اوپر سے فلک پکار اٹھتا ہے۔ "دادِ عجمی!"

میں اوپر دیکھے بغیر بڑبڑاتا ہوں "جیتے رہو" اور پھر سنبھل کر کہتا ہوں "ایک کھجور لے لوں؟"

وہ جھولی پھیلا کر کہتی ہے۔ "لے لو"

میں ایک کھجور اٹھاتا ہوں۔ تو وہ کہتی ہے "یہاں کھجوریں بکتی ہیں۔"

میں تین سو روپے کی پوٹلی اس کی طرف پھینک دیتا ہوں اور کہتا ہوں "مخبر دار نے رنگا ہے ایک صابی تین سو روپے میں خریداری داروغہ نے صابی سے ایک کھجور تین سو روپئے میں لی۔ یہاں ہر چیز بکتی ہے یہاں ہر چیز ایک جنس ہے یہاں انسان بھی بکتے ہیں اور کھجوریں بھی یہاں مذہب بھی بکتا ہے اور خدا بھی یہاں ذہن بھی بکتے ہیں اور ایمان بھی تم بے قصور ہو تم کھجوریں جمع کرو۔ میں تجارت کروں گا۔"

"تجارت!" وہ پوچھتی ہے

اور میں کہتا ہوں۔ "ہاں۔ سوداگری کھجوروں کی سوداگری بہت مفید سوداگری ہے۔ ایک لڑکی اور ایک کھجور کی قیمت برابر ہے۔ میں کھجوروں کے انبار بیچوں گا اور لڑکیوں کے ہجوم خریدوں گا۔"

میں جانے لگتا ہوں تو صابی کہتی ہے "میں نے مذاق کیا تھا۔"

میں کہتا ہوں۔ "یہاں ہر بات مذاق ہے۔ یہاں کوئی سنجیدہ نہیں یہاں سب مسخرے ہیں۔ یہاں انسان بھی مذاق ہے، محبت بھی مذاق ہے خدا بھی مذاق ہے، جنگ اور دہائی سب مذاق ہیں۔"

جھلی طرف سے بڑی بڑی مونچھوں والا ایک دراز قد زمیندار پکارتا ہے "کیا ہو رہا ہے صابی؟"

وہ چلاتی ہے "جی کھجوریں بیچ رہی ہوں!"

اور آج کل میں منٹگمری میں کھجوروں کا سب سے بڑا سوداگر ہوں یہ کھجوریں موضع کھجوریاں سے آتی ہیں لیکن ان پر عربی مصری اور عراقی کھجوروں کے لیبل چسپاں ہیں میں نے ایک مشہور یتیم خانے کیلئے کھجوروں کی پچاس بوریاں بھیجی ہیں ڈپٹی کمشنر صاحب کو میں نے آدھ آدھ فٹ لمبی کھجوروں کا ایک ٹوکرا بھیجا ہے اور ان کے اردلی کو اس قسم کی کھجوروں کے دو ٹوکرے ان خدمات کے بدلے میں مجھے خانصاحب کا خطاب ملنے والا ہے میرا ایک لڑکا اور چار لڑکیاں ہیں جن سے میں اکثر پوچھا کرتا ہوں "اگر تم اپنے جیب خرچ سے ہر روز اڑھائی آنے بچاؤ تو ایک مہینے میں تمہارے پاس کتنے پیسے جمع ہو جائیں گے؟"

"تین سو"

اور میں مہینے کے بعد تین تین سو پیسوں کی پانچ ڈھیریاں بہی کھاتہ میں درج کر کے کھجوریاں کی بیوہ زمیندارن کے پاس بھجوا دیتا ہوں جو آج کل میری منہ بولی بہن ہے اور جس کا بھائی اپنے بہنوئی کو قتل کرنے کے جرم میں کالے پانی سے ہوتا ہوا لوکیو پہنچ چکا ہے

جانِ ایمان کی خیر!

سورج مغربی افق کو مس کرتے ہی سونے کی طشتری بن گیا یہ طشتری ہولے ہولے کھسکتی سنہری کہرے میں ڈوب گئی اور کائنات نے جماہی لی مشرق سے نیندوں کی پریاں اپنے نشگیں پروں پر تیرتی مغرب کی طرف بڑھیں اور چولہے کے قریب بیٹھی ہوئی بالو نے آواز دی "باؤ جی آپ کے بستر کی چادر بدلنی ہوگی"

دواؤں کے بچھونے میں پڑی ہوئی چادر نے میرے نحیف جسم کے نیچے شکنوں کی جالی سی کاڑھ رکھی تھی اور تکیہ پر روغن بادام اور گرد و غبار نے گھل مل کر ایک عجیب چپٹے سے کیچڑ کی تہ ابھار دی تھی بچھونے کی اداسی نے میرے اعضا پر غنودگی سی طاری کر دی میں کروٹ بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "کل صبح بدلیں گے۔ بیماروں کے بستر صبح سویرے ہی بدلے جاتے ہیں"

وہ توے پر جمی ہوئی گلی سڑی تہوں کو چھپے کی نوک سے کھرچتے ہوئے بولی: "ٹھیک ہے پر صبح کو اگر کاپڑوسی آ نکلتا ہے نادوسروں کے سامنے چادر کو بدلا جائے تو نیچے سے گودڑسی توشک دیکھ کر وہ کیا خیال کریں گے ہمارے متعلق۔"

"پر مجھ سے اب بستر پر سے نہیں اٹھا جائیگا" میں نے کروٹ مکمل کر لی تھی وہ انگلیوں پر سے آٹے کی مروڑیاں اتارتی میرے پاس آ گئی چولہے کی آنچ نے اس کے گالوں پر گلال بکھیر دیا تھا۔ وہ بال راکھ کے ذروں سے بھورے ہو گئے تھے اور اس کے گریبان کے ایک بٹن کی بجائے خلاف معمول دو بٹن کھلے ہوئے تھے میرے ماتھے پر اپنے دوپٹے کا ایک پلو رکھا اور میری اس پر ہاتھ دھر کر محبت بھرے لہجے میں بولی "میں آپکو پھول کی طرح اٹھا کر ساتھ والی کھاٹ پر ڈال دوں گی آنکھ کی جھپکی میں چادر اور تکیہ بدل کر پھر آپ کو پلنگ پر لٹا دوں گی اس کے بعد آپکی پنڈلیاں اور پیر اور پیٹھ دباؤں گی آپ کے محبوب شاعروں کے گیت سناؤں گی ۔۔۔"

"گا کر؟" میں بچوں کے سے بھولپن سے بولا۔

"جی ہاں۔ گا کر ہی" اس نے میرے ہاتھ کو دبایا "گر میری سہیلی خالدہ ۔۔۔ وہ بوڑھے درزی کی لڑکی ۔۔۔ آنکلی تو اسے کہ دوں گی کہ تو کٹورا بجا میں گاتی ہوں، وہ کٹورا بجائے گی، میں گاؤں گی اور پھر ایسی غزلیں سناؤں گی آپ کو کہ آپ سو جائیں گے اور صبح تک سوتے رہیں گے اور میں آپ کے پکھا جھلتی رہونگی آپ کی چادر کی شکنیں ۔۔۔" اور وہ اچانک اپنا ہاتھ کھینچ کر چولہے کی طرف لپکی اور چلائی "جل گئی!"

سڑے ہوئے اناج کی بو سے صحن لبریز ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کر لیا کیا

ہُوا؟ روٹی جل گئی ہے کوئی بات نہیں۔ اور سہی وہ بھی جل جائے تو اور سہی اور اگر وہ بھی جل جلئے تو ــــــ"

"آپ مذاق کرتے ہیں" وہ بولی "جنگ کا زمانہ ہے ایک روٹی کا جل جانا ایک کھلیان کا راکھ ہو جانا ہے، سچ کہتی ہوں، بڑا غضب ہوا۔"

میں نے اُسے اپنے پاس بلا لیا۔ اور اُس کے ہاتھوں کو اپنے کمزور زرد اور کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لے کر بولا "روٹی جل گئی تو کیا ہوا سگھڑ پلا حد سے بڑھے تو کنجوسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تم نہ بیٹھی بیٹھی باتیں کر کے یہ زخموں پر تو پھاہے رکھے ہیں اُن کے مقابلے میں یہ چھٹانک بھر آٹا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ ــــ بالفرض ــــ تم نہ ہوتیں، تو جانتی ہو اس حالت میں کیا کرتا میں؟"

"کیا کرتے آپ؟" وہ پلنگ کے بازو پر بیٹھ گئی۔

میں نے سر ٹیڑھے جھکا کر آنکھوں کو خواب آلود بناتے ہوئے کہا "میں یہاں سے کسی بہانے نکل جاتا اور وہ سب سے اونچی کگر ہے نا کالوں کے بھیم میں ــــ گو جن نالے کی پرلی طرف ــــ وہیں سے چھلانگ لگا دیتا نیچے کھڈ میں ــــ میرا بھیجا ایک چٹان پر ہوتا تو میری انتڑیاں دوسری چٹان پر، اور میرے لہو اور ہڈیوں کے گودے سے آس پاس کے کنکر ــــ"

اس نے بلکتے ہوئے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا "ایسا نہ کہیئے۔ ایسا نہ کہیئے" وہ بچوں کی طرح مچل گئی۔ میں زور زور سے ہنسنے لگا اور اس کے رونے اور میری ہنسی کے امتزاج سے ایسی آوازیں بلند ہوئیں جیسے کانسی کی بہت سی گاگریں تالاب کے پانی میں ہوتے ہوئے ڈوبی جا رہی ہوں۔

پرائمری اسکول کے استاد کا بیمار ہو جانا اس لحاظ سے بے حد دردناک ہوتا

ہے کہ اُسے چھٹی نہیں ملتی۔ رخصت کی درخواست لکھتے وقت، ہیڈ ماسٹر کے
یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگتے ہیں۔ "بیمار ہو تو پڑے رہا کرو، محکمہ کی بلا سے
نوکری کرنی ہے تو سیدھے سیدھے مدرسے چلے آؤ، ورنہ تنخواہ کاٹ لیجائیگی!"
پرائمری مدرسے کے منشی کی تنخواہ کاٹ لینے سے اوّل تو یہی بہتر ہے کہ اُس
کا گلا کاٹ لیا جائے اور اگر گلا کاٹنے میں کوئی قانونی گرفت کا خوف ہو تو سرے
سے نام ہی کیوں نہ کاٹ دیا جائے۔ منشی جی کا گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالا جا
چکے تو نیچے سے تختے فوراً سرکائے جاتے ہیں موت اور زندگی کے درمیان معلق
رکھنے کی سزا تو شاید وحشی قوموں کے نزدیک بھی روا نہ سمجھی جاتی ہوگی۔
اگر مجھے دق کا مرض ہوتا تو شاید میں نام کٹوانے کی بھی کوشش کرتا۔ پر مجھے
کوئی عجیب سا بخار تھا۔ ہلکا ہلکا اور میٹھا میٹھا کانوں میں گونج سی جیسے دور
کوئی جھرنا بہ رہا ہو۔ آنکھوں میں جلن سی جیسے دیر تک کسی خوبصورت چیز کو
ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ کھانسی نام کو نہ تھی۔ اعضا میں ایک
غنودہ سا کسل بھر جاتا اور گلے میں اینٹھن سی ہوتی۔ گردن کے پٹھے تن جاتے
اور مجھے اتنی انگڑائیاں آتیں کہ میرا بند بند دکھنے لگتا۔ خود بالو نے ایک دن کہا
تھا۔ "دق؟ — آپ نے دق کا نام کیوں لیا ہے — دق والے تو یوں ہو
کر رہ جاتے ہیں"..... اُس نے مجھے ایک جلی ہوئی لکڑی دکھائی تھی اور میرے
شانوں کو دبا کر بولی تھی "اور آپ تو اللہ کے فضل سے بالکل تندرستوں کی طرح ہیں"
تنخواہ میں سے کچھ پس انداز کرنے کا شوق تو تھا لیکن مہینے کے اُنیس
بیس دن گزر جانے کے بعد بالو کے بکس میں کپڑوں کے نیچے سے کاغذ کا
آخری پرچہ نکال لیا جاتا اور پھر جب دق و بال کا عالم ... کر کے ...
آپس میں ٹکرا دے تو پس اندازی کرنے کا سوال ہی اُٹھ گیا۔ اب تو صرف ...

بھر کر کھانے کی فکر کرتی جس روز تازہ تازہ تنخواہ ملتی، بالو اور میں بہت بڑا جشن منانے دو تین قسم کے کھانے پکتے پڑوس سے گراموفون منگا لیا جاتا اور چونکہ بالو پڑھی لکھی تھی اس لئے غالب اور فانی کی غزلیں گائی جاتیں۔ ہولے ہولے کانسی کے کٹورے اور مٹی کی گاگریں بجائی جاتیں بالو کی سہیلی خاتون ورزن ہوائی دادو دے لاتی پڑوس کی چھتوں پر ننھے ننھے لڑکے اور لڑکیاں کھوڑلوں کو ہتھیلیوں میں جمائے دیر تک بیٹھے رہتے چوپال پر بیٹھا ہوا نمبردار کھڈی پر اُگے ہوئے دو گنتی کے چند بالوں کو کھجلا کر کہتا "منشی کو تنخواہ مل گئی گھڑا نج رہا ہے" ـــ اور پھر کچھ دنوں کے بعد وہی پیاز کی اشنک آدر تہیں اور وہی چنوں کی پھیکی پھسی دال جن میں بناسپتی گھی متعفن انڈے کے لیس دار لعاب کی طرح تیرتا رہتا۔

شاید یہ ناکافی اور ناواجب غذا ہی کا اثر تھا کہ اول اول میرے اعضا ٹوٹنے لگے اور پھر بخار نے آلیا پندرہ دنوں کی رخصت لیکر دیسی دوائیں کے جوشاندوں پر گزر کی حلق چھل گیا لیکن بخار نہ ٹلا آخری چھٹی کے روز قصبے میں ڈاکٹر کے ہاں مشورے کیلئے گیا معلوم ہوا کہ اس مقصد کے لئے وہ پانچ روپئے پیشگی لیتے ہیں ـــ اگر میرے پاس پانچ روپئے ہوتے، تو جوشاندوں ہی کا سلسلہ جاری رکھتا۔ یہاں تو خیراتی ہسپتال کی خبر سن کر ڈاکٹر سے مشورے کی دھن سمائی تھی گاؤں واپس آکر میلے سے تو لئے میں دو کپڑے لپیٹے اور اسکول جانے کی تیاریاں کرنے لگا بالو آنکھوں میں آنسو بھرے دہلیز پر کھڑی مجھے ٹک ٹک گھور رہی تھی میں رخصت ہونے لگا۔ تو کانپتی ہوئی آواز میں بولی "یہ نوکری ہے یا بیگار! انسان نوکری کرتا ہے آرام کی خاطر، اور یہاں بخار میں بھی مدرسے جانے کی کڑی پابندی ہے بہتر ہے اب کے چھٹی نہ ملے تو استعفے دیدیجئے گا۔"

"کھائیں گے کہاں سے؟" میں نے گٹھڑی کو گھماتے ہوئے کہا۔
"اللہ دے گا۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔
اور میں نے مسکرا کر کہا "پر اللہ تو یونہی نہیں دیتا۔ ایسا بھولا تو وہ بھی نہیں کہ ہاتھ پیر بھی نہ ہلاؤ اور کھاؤ بھی خوب ٹھونس ٹھانس کر ——" میرے دماغ میں مسئلہ تضاد و قدر کی کڑیاں چھنچھنانے لگی تھیں۔
لیکن وہ منطق اور دلیل کو جڑ سے کاٹ دینے والے یقین سے بولی "وہ یقیناً دیتا ہے۔ اسے اپنے فرائض کا احساس ہے وہ اگر یوں ہاتھ کھینچ لے تو آدم کی نسل سوکھ سڑ کے ڈھانچوں اور بچے کچھے پنجروں کا ——"
"جانے بھی دو مجھے دیر ہو رہی ہے" میں نے گٹھڑی کو کاندھے پر لٹکایا اور اس کے گالوں کو تھپتھپا کر کہا۔ "دعا کرنا —— کرو گی نا؟"
اور دونوں ہاتھوں سے بھیگے ہوئے چہرے کو چھپا کر دھم سے دہلیز پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "فی امان اللہ۔"
جب میں اسکول میں پہنچا تو کمر دکھ رہی تھی۔ اور پنڈلیوں کے ڈھیلے ڈھالے پٹھوں میں بے ہنگم تناؤ سے لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ ننھے شاگرد میرے آس پاس اکٹھے ہو گئے "ماسٹر جی آ گئے، ماسٹر جی آ گئے" —— وہ ناکیں سڑسڑاتے تالیاں پیٹتے، تختیاں بجاتے چیخنے لگے اور میں نے انہیں اپنی اپنی جگہ پر بٹھاتے ہوئے کہا "بڑے ماسٹر جی نے کہا یہ باتیں سن لیں تو جانتے ہو ان کا مولا بخش سن سے اٹھتا ہے اور ٹھن سے پڑتا ہے۔"
"وہ تو کل ٹوٹ گیا تھا۔" ایک لڑکا بولا۔ "شام لال کے مارے تھے، کسی ہڈی پر لگ کر دو ہو کر رہ گیا۔"
اچانک مجھے ساتھ کے کمرے سے ایک لڑکے کی چیخیں سنائی دیں کھڑا کی

میں نے دیکھا تو ہیڈ ماسٹر شام لال کی چٹکیاں لے رہا تھا اور جبڑے کے ساتھ ساتھ ہونٹوں اور بھوؤں کو بل دیتے ہوئے پکارتا تھا۔ ادھر میرے سول ڈن اُدھر تمہیں نقل کرنے کی سوجھی۔ پاپی کہیں کے ۔۔ ولایت ۔۔ ابے بزدلی کے بچے ۔۔ کہہ دیا تھا نا اپنے باپ کو نئی سونٹی کے لئے ۔۔ اچھا ۔۔ تو اب بتا شامو کہاں ہے تیری نقل کاپی ۔۔ کہاں ہے؟ ۔۔ نہیں ہے نا؟ ۔۔ تو لے ۔۔ اِیں اں اں اں اں اں یہ لے! ۔۔ اب کے شام لال خوفناک چٹکی کو برداشت نہ کر سکا۔ پسلیاں لے کر تڑپا اور ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ میں لٹک سا گیا۔ ہیڈ ماسٹر کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو دھم سے منہ کے بل گر پڑا بے حس و حرکت ۔۔ بے جان ۔۔ جیسے مردہ کتورا!

مدرسے میں کھلبلی مچ گئی۔ میں شام لال کو جانتا تھا۔ وہ ایک غریب کاندار کا بیٹا تھا اس کی ماں مر چکی تھی اس لئے باپ چڑ چڑے مزاج کا ہو گیا تھا۔ میں دوڑا دوڑا اندر گیا ہیڈ ماسٹر نے مجھے دیکھا تو بولا۔" اچھا تو آ گئے آپ؟ خوب! اس وقت کتنا بخار ہے آپ کو؟ آپ تو سوکھ کر کانٹا ہو گئے ہیں بالکل۔ میں سوچ رہا تھا کہ ماسٹر صاحب آئیں تو انہیں مشورہ دوں کہ ذلیل نوکری چھوڑ چھاڑ کر اپنی نوابی چلائیے یا غیچوں میں دندنائیے۔ گندلی پر سوئیو اور گلچھرے اڑائیے یہاں کیا دھرا ہے آپ کی دلچسپی کیلئے بجز ہوائی لینے اور ڈھونچے کے پہاڑے اور بہتی ہوئی ناکوں والے بچے اور مجھ ایسا بد مزاج ہیڈ ماسٹر؟"

اور جب اُس نے شام لال کو پانی کے وحشیانہ چھینٹوں سے ہوش میں آتے دیکھا تو بولا۔" اب اٹھاؤ بھی اس مردود کو۔ پڑا کراہ رہا ہے لاڈلا ۔۔ مکار ۔۔ ریوڑیاں کھا لیتے ہیں کاپی نہیں خرید سکتے ۔۔ ہاں تو ماسٹر صاحب کیا صلاح ہے آپ کی؟ آپ یہاں نوکری کرنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ سیدھی بات کیجئے۔ میرا

اسکول تباہ ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "حضور آپ میرا چہرہ تو دیکھیں اور یہ میری پنڈلیاں اور یہ بائیں اتنی سی گردن اور ــــــ"

ہیڈ ماسٹر نے میری بات کاٹ لی "آفرین ہے آپ پر ــــــ بانہیں اور پنڈلیاں تو دکھادیں۔ اب لگے ہاتھوں ان اپنے روحانی فرزندوں کے سامنے دھوتی بھی اتار دیجئے تاکہ یہ اچھا سبق سیکھیں۔ ماسٹر صاحب آپ کی ذات کیا ہے؟"

شام لال رینگتا ہوا بوری کے پھٹے پرانے ٹکڑے پر یوں جا بیٹھا تھا جیسے بلی کا شکست خوردہ بلونگڑا اکڑ کے اب مجھے گھور رہے تھے اور میں حال اور مستقبل کے گھپ اندھیرے میں ان دیکھی راہوں پر گھوم رہا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے میری ذات پوچھی تو اچانک یہ اندھیرے چھٹ گئے، اور جگمگاتے افق سے میرا ضمیر پکارا۔ اور میری زبان نے میرے ضمیر کی ترجمانی کر دی "آپ میری ذات پوچھتے ہیں؟ میں انسان ہوں۔ سمجھے آپ؟ اور یہ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ مجھے آپ ایسے حیوان کے ماتحت کام کرنا پڑا۔ مجھے اس ملازمت کی ضرورت نہیں جہاں انسان جوتا بن کر رہ جائے، جب چاہا پہن لیا جب چاہا اتار پھینکا، جب چاہا ــــــ"

ہیڈ ماسٹر لال پیلا ہو کر چلایا "خاموش!" ــــــ لڑکے کانپ کر کتابوں پر جھک گئے، پرلی طرف سے ایک استاد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا، شام لال نے بستے سے ایک بوسیدہ سی کتاب نکال کر ورق الٹنے لگا۔ اور باہر بیٹھے ہوئے میرے ننھے شاگرد گردنیں بڑھا بڑھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ میں پلٹ کر ان کے پاس آیا۔ استعفےٰ لکھا اور ہیڈ ماسٹر کی میز پر رکھ دیا۔

استعفیٰ کی منظوری کے انتظار میں ایک ہفتہ گزر گیا اس عرصہ میں کئی مرتبہ بخار ہوا کھانسی بھی آنے لگی۔ سینے میں بھی گاہے گاہے ہوکیں اٹھنے لگیں ایک ذریعے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہیڈ ماسٹر میرے جانے کے بعد مدرسے کی عمارت کو فینائل سے دھلا دے گا۔

آٹھویں روز منظوری آگئی اور جب میں چند رجسٹر ہیڈ ماسٹر کے حوالے کر کے اٹھا تو دوسرے اساتذہ بھی ہیڈ ماسٹر کے خوف سے میرے نزدیک نہ آئے۔ میرے شاگردوں میں سے چند ایک نے پوچھا "ماسٹر جی پھر چھٹی ہے؟"
میں نے کہا ہاں ——— بڑی ضروری چھٹی ہے" ——— اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیر کر جب میں اسکول کے احاطے سے باہر جانے لگا۔ تو دور سے ہرکارے نے ہانک لگائی "آپ کا ایک خط ہے ماسٹر جی ——— وہ ٹیڑھے ٹیڑھے موٹے موٹے حرفوں والا خط!"

یہ بالو کا خط تھا۔ میرے رخصت ہونے کے تین روز بعد اس کی ماں میری عیادت کو آئی تھی اور اسے بڑی منتوں کے بعد اپنے ہمراہ لے گئی تھی ——— مجھ سے استدعا کی گئی تھی کہ میں دھرم پورہ سینیٹوریم میں داخل ہو جاؤں، کیونکہ میں بالو کی ماں کے خیال میں مدقوق تھا۔ اس سلسلے میں رقم کی فراہمی کیلئے مکان کو بیچ ڈالنے کی صلاح دی گئی تھی اور ساتھ ہی مجھے تسلی دی گئی تھی کہ مجھے تنہائی محسوس نہیں کرنی چاہیئے، بیماری میں یونہی ہوتا ہے، اور یہ کہ مکان کی چابی دکھنی منڈیر کے سب سے اونچے سوراخ میں ایک چیتھڑے میں لپٹی پڑی ملے گی۔

بخار سے جلا بھنا جب میں گھر پہنچا، اور دکھنی منڈیر کے سب سے اونچے سوراخ سے چیتھڑا نکالا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے گزرے ہوئے

زمانے کی نعش اپنی انگلیوں میں تھام رکھی ہے، گھسی ہوئی چابی جو بالو کی انگلیوں میں تارے کی طرح چمکتی تھی اپنی خنکی سمیت جیسے میرے تپتے ہوئے جسم میں رینگ کر دل و دماغ میں اچھلنے لگی اور میری امیدوں کے پٹ کھٹ سے کھل گئے، بالو کو صرف صحت مند انور خان سے محبت تھی اور مریض انور خان تو کوڑھی ہے، کمین ہے۔ میرے پھیپھڑوں میں میٹھی یادیں پھڑپھڑائیں اور میری نبضوں میں بیتے ہوئے لمحے ناچنے لگے۔

دھم سے میں ایک کھاٹ پر گر گیا۔ گھبرا کر اٹھا۔ دیوار کے ساتھ بالو کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ اور قفل میں پھنسی ہوئی چابی پر ایک بھڑ بیٹھی اپنے پر سنوار رہی تھی باہر گلی میں بھیڑوں کا ایک ریوڑ ممیاتا ہوا گذر رہا تھا اور چرواہا چلا رہا تھا "تمہاری ماں مرے یہ تنگ گلی ہے تنگ گلی ایک ایک کر کے گزرو۔

—— پھنس کر کھڑی ہو گئیں یاں کمبختیں، چھینک رہی ہاں، ہانپ رہی ہیں، ہلتی نہیں ٹھس ٹھسا کر کھڑے ہونے میں تمہیں مزا آتا ہے ہیں؟ —— ہئے اور پھر پھٹ سے ایک لاٹھی پڑی اور گلی میں بھگدڑ مچ گئی، بھیڑیں تنگ کوچے سے نکل گئی تھیں۔ اور گلی سنسان ہو گئی تھی —— میرے دل و دماغ کی طرح اجاڑ اور چپ چاپ غبار آلودہ اور متعفن خاک پر ماضی کے نقوشِ قدم، جن کو شام کی نرم رفتار ہوائیں آہستہ آہستہ مٹا رہی تھیں۔

لیکن بالو کی گذشتہ محبت اتنی گہری اور سحر اثر تھی، اور پھر نوکری کے چھٹ جانے کا دکھ اتنا سخت تھا کہ میں نے بہت جلد شکوک و شبہات کے غبار اڑا دیئے اور دوسرے روز بخار کی شدت میں اُسے ایک مفصل خط لکھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ تمہیں غلطی ہوئی ہے، مجھے دق نہیں، موسمی بخار ہے اور

اگر مجھے دق بھی ہو تو بھی تمہارا میرے پاس موجود رہنا کتنا ضروری ہے۔ تم خط ملتے ہی چلے آؤ۔ منگل کے روز میں شام کوٹ کے اسٹیشن پر تمہارا انتظار کروں گا۔

ان دنوں مجھے ایک ہفتے میں سات دنوں کے بجائے سات سالوں کا تجربہ ہوا۔ منگل کے روز سورج کو جیسے مشرقی غاروں میں کسی قوت نے جکڑ لیا، پو پھٹی اور پھر پھٹتی ہی رہی مؤذن کی آواز میں شک سا لرز رہا تھا، جیسے ابھی صبح ہوئی ہی نہیں، اور جب دکھنی منڈیر پر سونا بکھر گیا اور چڑیاں خلاؤں میں بکھر گئیں تو میں لاٹھی ٹیکتا اسٹیشن کو چل دیا۔ اس روز مجھے بخار بھی نہیں تھا اور سینے کی جلن تو جیسے کبھی ہوئی ہی نہ تھی۔ ایک سنسان گلی کی نکڑ پر مجھے بانو کی نوجوان بیٹی خاتون زرینہ ملی۔ سر پر سرسوں کے ڈنٹھل ایک ہاتھ میں سرسوں کے پھول۔ ہلدی کی رنگ برنگی اوڑھنی۔ ایڑیوں تک لٹکتی ہوئی اور جوتے کے بٹن پہنتے ہوئے بولی "ارے منشی انور خان! تم یہیں ہو؟ بانو تو کہہ رہی تھی، تم ادھر لاٹ والا شہر میں ہو، بڑے ہسپتال میں"۔

میں نے کہا "بڑے ہسپتال میں جی نہیں لگا۔ اس لئے لوٹ آیا۔ اور میں اب اچھا بھی تو ہوں۔ بابا کی صحت تو ٹھیک ہے؟"

سرسوں کے پھولوں کو گالوں پر پھیر کر بولی "دعائیں دیتا ہے جان ایمان کی خیر ہو، اللہ کرے تم جگ جگ جیو۔ ہم غریب بے چارے صرف دعا ہی تو مانگ سکتے ہیں"۔

میں نے کہا "جیتی رہو"۔

بولی "تم جیو، میں نگوڑی کیا کروں گی جی کر"۔

میں نے پوچھا "کیوں؟"

مسکرا کر بولی "بس" ——— اور اس نے سرسوں کے پھولوں میں اپنی

ٹھوڑی رکھ کر مجھے ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا. سرمئی سیپھٹے ہتیلیوں پر جھک آسے اور چوبے کے بٹن تو جیسے تڑاق سے ٹوٹنے کیلئے ایک لمبی سانس کے منتظر تھے ۔ "کہاں چلے؟" اُس نے پوچھا.

میں نے لاٹھی کو ایک پتھر سے بجاتے ہوئے کہا. "یونہی اسٹیشن تک جارہا ہوں، ٹانگیں سیدھی کرنے۔"

ڈنٹھلوں کی ننھی سی گٹھڑی کو ماتھے پر رکھ کر بولی۔ "اکیلے میں جی گھبراتا ہوگا بالو بی نے اچھا نہیں کیا۔ خیر!" ــــــ اور وہ صاف سیدھی گلی میں دایئں بایئں مٹکتی ٹھوکریں کھاتی چلدی ۔

اسٹیشن پر پہونچا دُور دھواں اُڑتا دکھائی دیا۔ میرے دماغ میں قسم قسم کی سوچیں تھم تھم تھا ہوگئیں گاڑی آئی۔ تو ہلکا ہلکا بخار تیز ہوکر کنپٹیوں میں طبلہ سا بجانے لگا۔ بڑی لذت ناک انگڑائیاں آیئں، نظروں کی اڑان شروع ہوئی اور جب گاڑی چلدی، تو میرا دل نڈھال پرندے کی طرح دھپ سے بیٹھ گیا۔ گاڑی سے صرف ایک بوڑھا اترا جس نے بابو کے سامنے پگڑی کھولی، اور کسی کونے سے تہ بہ تہ لپٹا ہوا ٹکٹ نکال کر دکھایا۔ پگڑی لپیٹ کر لوٹلیاں گھسیٹتا ایک طرف چلا، پلٹ کر میری طرف دیکھا، اور پھر میرے قریب آکر بولا۔ "یہ شام کوٹ ہی ہے نا؟"

میں نے کہا۔ "بابو سے پوچھو!"

غصے میں آکر بولا۔ "اور کیا تم قندھار سے آرہے ہو؟"

میں وہیں ننھی ننھی کنکریوں پر بیٹھا رہا، اور جب وہاں جی نہ لگا تو کچھ پرے چیونٹیوں کے سوراخ کے قریب آبیٹھا اکیلے میں جی گھبرانے لگا تھا۔ چیونٹیوں کی آمدورفت سے طبیعت بہلی رہی دوسری گاڑی سے میں

بانو کے میکے چلدیا اور جب اُنکا دروازہ کھٹکھٹایا اور بانو کی ماں باہر آئی، تو اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ "بیٹا انور خاں؟ تم دق والے بڑے ہسپتال میں نہیں گئے؟ چلے جاتے بیٹا — کیوں نہیں گئے؟ — وہ بڑی بیماری والے یوں اِدھر اُدھر نہیں پھرا کرتے۔ میں یہیں کھاٹ لائے دیتی ہوں۔ اندر کہیں سایہ بھی تو نہیں پانی پیو گے؟" اور وہ دہلیز سے ٹھوکر کھاتی اندر بھاگ گئی۔

ایک ٹوٹا پھوٹا کھٹولا میرے سامنے ڈال دیا گیا۔ مٹی کے میلے سے پیالے میں گڑ کا شربت پینے کو ملا۔ "شیشے کے گلاس ٹوٹ گئے ہیں" بڑھیا بولی۔ "نئے خریدے نہیں، جنگ کا زمانہ ہے اس لئے — اے بانو بیٹی — انور خان آیا ہے — بانو بڑی اداس رہتی ہے بے چاری — پر بیٹا تم کیسے آ گئے یہاں؟"

میں نے کہا۔ "میں بانو کو ساتھ لے جاؤں گا۔"

"بانو کو ساتھ لے جاؤ گے؟" — اب بڑھیا ہاتھ کے اشارے سے دروازے پر کھڑی ہوئی۔ بانو کو میرے قریب نہ آنے کی تلقین کر رہی تھی "تم ٹھیک تو ہو لو بیٹا۔ یہ بڑی بیماری ہے نا!"

میں نے بانو کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار میں ایک تنکے کو کھرچ رہی تھی۔ بولی میری پی ملی تھی آپ کو۔"

"اور میری چھٹی ملی تھی تمہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ "ملی تو تھی مگر ماں کہتی ہیں کہ آپ — آپ —"

اچانک بڑھیا چلائی۔ "بھاگ جا!"

دروازے پر بانو کا چھوٹا بھائی شیشے کے گلاس میں گڑ کا شربت ڈالے آنکلا تھا۔ "بھاگ جا۔ تیرے بھیا تھکے ہوئے ہیں — ہاں تو بیٹا

انور خاں ـــــ"

میں نے کہا "تو کیا بانو میرے ساتھ نہیں آئیگی؟"
بڑھیا گھبرا سی گئی "بانو کی مرضی ہو تو لے جاؤ اسے"
میں نے بانو سے پوچھا "تیار ہو؟"
وہ وہیں سے بولی "میں کہتی ہوں آپ ذرا ـــــ آپ کچھ ـــــ"
میں لاٹھی کے سہارے اٹھا "تم ٹھیک کہتی ہو" ـــــ اور جب میں ہارے ہوئے قدم اٹھانے لگا تو بڑھیا پکاری "تمہیں بڑی بیماری ہے نا اس لئے صرف اس لئے بیٹا ورنہ بانو تمہارا ہی مال ہے ـــ پر تم جا کہاں رہے ہو؟ بانو بھی سسکیوں کے درمیان بولی "آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ کچھ دیر تو ٹھہریئے۔"

لیکن میں رینگتا چلا گیا۔ اور جب میں نے گلی کے موڑ پر پہونچ کر پلٹ کر دیکھا تو بڑھیا کھاٹ کو مرے ہوئے چوہے کی طرح اٹھا کر دھوپ میں رکھ رہی تھی اور بانو دہلیز پر بیٹھی میری طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی امیر بچہ اپنی کٹی ہوئی پتنگ کو دیکھتا ہے۔

بخار میں جلتا، سینے کے درد سے کراہتا جب میں شام کوٹ اسٹیشن پر اُترا۔ تو مجھے گاڑی کے ایک ڈبے میں کھڑکی کے قریب ہیڈ ماسٹر بیٹھا نظر آیا۔ ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی رنگ اڑا ہوا تھا۔ ہونٹ کھلے ہوئے مجھے دیکھتے ہی اپنے ایک ساتھی سے بولا "یہی ہے وہ ـــ یہی ہے ـــــ اور گاڑی چل دی!

گرتا پڑتا کافی دن ڈھلے میں اپنے گاؤں کے قریب پہونچا پگڈنڈی کے پاس خاتون درویزن ایک مینڈ پر ساگ توڑتے ہوئے ہوتے کوئی ہوائی

دوہر گنگنا رہی میرے ذہن نے اچانک میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے تارے سے بکھیر دیئے، میں بے تحاشہ بول اٹھا۔ "اے درزن کی بچی!"
سر اٹھا کر بولی۔ "ارے منشی انور خان!"
میں نے کہا۔ "ارے تو یہاں بیٹھی ساگ توڑتی رہتی ہے اور ہماری شامیں لٹی جا رہی ہیں پگلی!"
"شامیں!" میلنڈ سے اترتے ہوئے اس نے تعجب سے کہا۔
"اندھیری شامیں۔ سرمئی شامیں!"
اس نے مسکرا کر ایک جنگلی پھول مجھ پر پھینک دیا۔
ـــــ اور جب اسی شام کو دروازے کی زنجیر کی جھنجھناہٹ، تو دھنی منڈیر کے سب سے اونچے سوراخ میں سے ایک بڑا پتھر سے اڑ کر کہیں غائب ہو گئی۔ ذہن کی کڑیاں کٹ کٹ کر گر گئیں اور خلد سے نکلا ہوا آدم ایک نئی جنت میں اتر پڑا۔

نشیب و فراز

کائنات نے چپ سادھ لی تھی۔ اور پچھمی پربت سے ہاتھ بھر اوپر سورج جیسے لٹک کر رہ گیا تھا۔ دوپہر کو تو میں نے سایوں کو حرکت کرتے بھی محسوس کیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ سائے رینگتے جا رہے ہیں مکان کے سائے کا آخری خط اب بیری کے تنے سے مس کر رہا ہے تو اب بیری کی پرلی طرف ناند پر بڑھ رہا تھا، اب دیوار کی چوٹی پر ہے تو اب دیوار پھاند کر پرلی طرف خشک بہیکڑوں کے آس پاس بکھرے ہوئے کنکروں پر کھسکا جا رہا ہے۔ لیکن جب شام قریب آئی تو لگتا تھا وقت ہار کر بیٹھ رہا۔ سائے جہاں تھے وہیں جب تھم گئے، سورج لٹک گیا، اور کھیت کے پرلے کنارے پر بیٹھا ہوا رکھوالا اپنے گائے ہوئے دوہا

کی غیر محسوس لہروں میں الجھ کر رہ گیا آک کے پیڑ کے پاس بت کی طرح
جما بیٹھا تھا بنسری پاس دھری تھی اور اپنے ٹھکانوں کو جاتی ہوئی چڑیوں
کے غول آزردہ سی فضا سے اتر کر باجرے کی جھکی ہوئی بالوں سے چمٹ
گئے تھے۔

بہت دیر تک نہ چڑیاں اڑیں۔ نہ کھیتوں کے رکھوالے نے حرکت کی نہ
سورج نے بھی پربت کی منتظر چوٹی کو چھوا۔ گاؤں کے قلب سے لپکتی
ہوئی پگڈنڈی پر دو مسافر لاٹھیوں کے سروں پر لوٹلیاں لٹکائے نشیب
میں اتر رہے تھے اور مسجد کے مینار پر ایک چیل پر سمیٹے کھلونے کی طرح بے
حس بیٹھی تھی۔

مجھے حیرت ہونے لگی کہ آخر اتنے بڑے واقعے بلکہ حادثے پر گاؤں
والوں اور گاؤں والیوں نے کسی قسم کی مسرت یا غصے کا اظہار کیوں نہیں کیا
شاید مجھے رات کے وقت کھلیان پر آنے کا پیغام بھیجے اور گاؤں میں کھلبلی
نہ مچے اور پھر یہ وقت کتنا ذلیل کارندہ ہے مشیت کا کہ مہینوں کی محنت سے
حاصل کئے ہوئے لمحے کو اپنے استخوانی پنجے میں دبائے بیٹھا ہے، نہ آگے بڑھتا
ہے کہ شیدو پگڈنڈی پر سمٹتی سمٹاتی گنجان کھیتوں کی بے کراں وسعتوں کو
زندگی کی تڑپ بخشتے میرے پہلو میں آ بیٹھے اور نہ پیچھے ہٹتا ہے کہ میں شیدو
کی حشر انگیز پلکوں کی کاٹ سے بالکل بے خبر کالج کے محرابی برآمدوں میں اڑتے
ہوئے لمحوں کو گھماتا اور اچھالتا پھروں!

میں نے کھلیان پر سے ایک تنکا اٹھایا۔ اور اسے ایک آوارہ چیونٹے
کے قریب رکھ کر اس کی حرکات دیکھنے لگا۔ چیونٹا تنکے کو مس کر کے رک گیا
خشخاش کے دانے ایسے سر کو ادھر ادھر گھمایا۔ پلٹ کر بھاگا۔ تھوڑی دور

جاکر رُک گیا۔ گھوما اور واپس آکر تنکے پر چڑھ گیا۔ میں نے تنکا اوپر اٹھا لیا
اب چیونٹا کبھی ادھر بھاگتا ہے کبھی اُدھر دوڑتا ہے ایک کنارے پر جاکر
رکتا ہے دوسرے کنارے پر جاکر فوراً پلٹتا ہے اور میں مسکرائے جا رہا ہوں
اس کی بے بسی پر۔ کبھی چیونٹا تنکے کے کسی حصے پر رُک کر نیچے دیکھتا ہے
اور پھر سر کو ادھر اُدھر گھما کر اپنا غیر مختتم چکر شروع کر دیتا ہے میں تنکے کا دو
سرا انگلیوں میں تھام لیتا ہوں جس کا چکر لگا کر چیونٹا پلٹتا ہے ایک بار
میں اُس کی بالوں ایسی ننھی ننھی ٹانگوں میں اتنا محو ہوا کہ انگلیاں بدلنا
بھول گیا۔ چیونٹا میرے ہاتھ پر چڑھ گیا اور جھک کر مجھے اس زور سے کاٹا کہ
میری چیخ نکل گئی، ہاتھ جھٹکا اور پھر چیونٹے کا پچھلا حصہ پکڑ کر اسے کھینچا چیونٹا
دور ہو کر رہ گیا۔ سر اسی طرح میرے ہاتھ کی الٹی طرف پیوست تھا اور دھڑ کا دوسرا
پلپلا حصہ میری گھبرائی ہوئی انگلیوں سے چھوٹ کر تنکے کے پاس گر گیا تھا
بڑی مشکل سے میں نے چیونٹے کا سر جلد سے الگ کیا۔ جہاں درد محسوس
ہونے لگا تھا وہاں چٹکی بھر خاک ڈال دی اور پھر اچانک سامنے دیکھا
سورج ڈوب چکا تھا۔ رکھوالا جا چکا تھا۔ چڑیاں اڑ چکی تھیں اور [illegible] کے
قلب سے لپکتی ہوئی پگڈنڈی سرمے کی پھیلی ہوئی دھاری سی سادم ہوتی گئی
سا اور پھر اس دھاری پر بھی کاجل پھر گیا۔ ستارے اتنی بڑی تعداد
میں اُبھرے کہ اب سے پہلے کیا اُبھرے ہونگے۔ خاموشیاں اندھیری فضا
میں سنسنانے لگیں اور بہت دُور کہیں گیدڑ پکارے۔ آدھی رات تک میرا
ذہن غیر مرئی قدموں کی چاپ سنتا رہا اور جب تشنج بخار کی خلا وسوسوں
سے لبریز ہو گئی اور جب سامنے گاؤں میں آخری دیا بھی بجھ گیا تو میں اٹھا
ٹارچ کی روشنی میں منڈھ کو پھاندنے ہی والا تھا کہ ایک بھورا رنگ شپ سے

ایک کھیت سے نکلا۔ اور جپ سے دوسرے کھیت میں گھس گیا۔ ٹارچ پر میری انگلیوں کی گرفت اتنی مضبوط ہو گئی کہ اگر چاپانی مار (؟) تو چیک کر رہ جاتا نہایت احتیاط سے آگے بڑھا مگر اب ہر چیز پر ناگ کا گمان ہوتا تھا۔ شیدو کے تصور پر بابنی کے باسیوں کے بل پر بل کھاتے ہوئے چھا گئے۔ زندگی آنکھوں اور قدموں میں سمٹ آئی۔

مگر جب میں گاؤں کے بالکل قریب پہونچا تو خیال آیا شاید سیدو کسی دوسرے رستے سے کھلیان پر پہونچ گئی ہو میں بھی تو عجیب سی راہوں پر سے ہو کر وہاں پہنچا تھا ٹارچ کے بٹن کو تھوڑی قوت سے دبا تا جب میں اس مقام کے نزدیک پہونچا جہاں سے ناگ گزرا تھا تو رک گیا اور پھر آگے جانے کا کوئی فائدہ بھی تو نہ تھا وہیں سے ٹارچ کی روشنی کھلیان پر گھمائی اور مایوس ہو کر پلٹا ابھی میں چند قدم ہی چلا ہونگا کہ تیزی سے اٹھتے ہوئے پیروں کی دھب دھب اور چوڑیوں کے تیز اور پریشان چھناکوں نے میرے اوسان کو جکڑ لیا۔ شیدو ہانپتی ہوئی آئی اور میرے قریب رک کر بولی "واپس چلو پیدے"۔

ماتھے سے پسینہ پونچھنے کیلئے اس نے ہاتھ اٹھایا تو چوڑیاں چھنن سے اس کی کہنی پر جا گریں۔

"یہ چوڑیاں پکڑوا دیں گی ہمیں"۔ میں نے کہا۔

"اچھا!" ——— اس نے اپنا ایک بازو ایک پتھر پر رکھا اور چوڑیوں پر گھونسا جما دیا ——— "شیدو!" میری سرگوشی چیخ کی حد تک پھو آئی ——— مگر اس نے دوسرے بازو کو ننگا کر کے ٹھن سے ہاتھ مارا۔ اور پھر ہلکی سی تالی بجا کر بولی "اب؟ اب بتاؤ، کیسے بولیں گی چوڑیاں؟"

ہم نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامنا چاہا۔ کہ اچانک بہت سے قدموں کی

چاپ نے ہم دونوں کو ٹکرا دیا۔ "شیدو شیدو" کی مسلسل آوازیں آنے لگیں میں
ادھر کھسک آیا اور شیدو ادھر سرک گئی۔ میں گنجان کھیت کے بھیگے بھیگے پودوں
کو ہاتھوں کے بل چیرتا بہت دور نکل گیا۔ "شیدو شیدو" کی آوازیں آتی رہیں اور معاً
تڑاخ سے کوئی بولا۔ "یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے چھلپائی!"

مجھے گمان سا ہوا کہ کسی نے شیدو کی پیٹھ پر دھول جمائی ہے کیونکہ
دھرتی کا کلیجہ دھم سے بیٹھتا محسوس ہوا۔ میرا خون کھول اٹھا مگر کھولاؤ مستقل
نہیں ہوتا۔ اور زندگی کسے عزیز نہیں!

جب چار طرف خاموشی چھا گئی اور ننھے ننھے کیڑے پودوں سے رینگ
کر میرے جسم سے چمٹ گئے تو مجھے اچانک اپنی کمزوری اور بزدلی کا احساس ہوا۔
کھیت سے نکل کر مینڈ پر آیا تو دور جھیل کی اس طرف مدقوق چاند ہانپ رہا تھا
اور قریب ہی ایک درخت پر کوئی پرندہ نیند میں بڑبڑا رہا تھا۔ زرد بیمار چاندنی
سے اندھیرا اڑتی ہوئی گرد کی شکل اختیار کر رہا تھا۔

گھر آ کر بستر پر گرا تو محبت کی یخ بستگی اور موسم کی خنکی نے رگوں میں
کپکپی سی دوڑا دی۔ کچھ سویا۔ کچھ جاگا۔ مگر جب گھر والے جاگے تو میں سو رہا تھا۔
امی نے ہولے سے شامیانہ ہلا کر کہا۔ "باہر تمہارا دوست بیٹھا ہے کب سے
راہ دیکھ رہا ہے تمہاری۔ آخر ایسی نیند بھی کیا؟"

میں غنودہ آواز میں بولا۔ "کیا سورج نکل آیا؟" اور پھر آنکھیں کھولتے ہی
مشرق کی چکاچوند نے رگوں میں سنسنی سی دوڑا دی۔ میں نے انگڑائی کے
دوران میں پوچھا "کب نکلا سورج؟"

امی ہنس کر بولیں "صبح کو"

میں نے بھی ہنسنا چاہا مگر گلے میں جیسے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی کرچیاں

اٹک گئی ہوں سلیپر گھسیٹتا باہر آیا۔ اکبر ایک نکیلے کنکر سے خاک پر مثلثیں سی بنا رہا تھا چھوٹتے ہی بولا "کچھ سنا؟"

صبح کی سنہری چڑیاں پڑوس کی بیری پر چلانے لگیں۔ اور آٹا پیسنے والی مشین بلکی "کیا! کیا! کیا!"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

اکبر نے مثلثوں کو پاؤں سے مٹاتے ہوئے کہا "اچھا تو تم نے کچھ نہیں سنا؟ وہ تمہاری شیدو بھی جا رہی ہے نا۔"

"کیسے؟" میرے ذہن کی پگڈنڈیوں پر شپا شپ ناگوں کی آمد و رفت جاری ہو گئی۔ اور میرے جسم پر کیڑے سے رینگنے لگے میں نے اکبر کی کلائی کو اتنی شدت سے دبایا کہ وہ بل کھا کر دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہو گیا۔ بولا "یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ شیدو کا باپ چودھری کا مقروض ہے پانسو دینے ہیں شاید وہ مدت سے شیدو کا سودا کرنے کی دھن میں تھا اتفاق سے کل لڑکیوں کے سوداگر آ نکلے ہیں۔ وہ چار سو دیتے ہیں، یہ پانسو مانگتا ہے، اور ادھر چودھری کہہ رہا ہے کہ اگر آج ہی پورے پانسو کے پانسو نہ ملے تو زین خان حوالات کی سلاخوں سے لپٹ لپٹ کر پڑا رو دے گا۔"

میں سوچنے لگا بالکل انہونی باتیں جیسے کوئی قیدی جیل کے داروغہ پر جھپٹنے اور اُسے چبا کر نگل جانے کے منصوبے باندھ رہا ہو اور پھر اپنے سامنے مضبوط سلاخوں کے ناگ دیکھ کر اندھیری کوٹھڑی کے متعفن کونے میں سمٹ کر رہ جاتا ہو، میں نے شیدو کے دشمنوں کو چبانے اور نگلنے کی راہیں تراشنا چاہیں مگر میرے سامنے خاندانی وجاہت کی دیواریں حائل تھیں۔ اکبر سے کوئی مشورہ کئے بغیر میں اپنے گھر آ گیا۔ والد اپنی سفید داڑھی میں انگلیاں ڈالے نماز

ان پہاڑیوں کی طرف کھلے میدان ہیں اور ان میدانوں میں اَن گنت راہیں ہیں جگہ جگہ پر ننھے دیہات ہیں اور پھلواریاں ہیں۔ اسٹیشن میں گاڑیاں ہیں وہ گاڑیاں جن کی منزلیں دور دراز ہیں اور جن کو ان جذبات کا احساس تک نہیں جو اُن میں بیٹھے ہوئے مسافروں کے دلوں میں تڑپ اور بھڑک رہی ہیں۔

خیالی دنیا میں بھٹک بھٹک کر میرا ذہن قانون کی طرف پلٹا وہ قانون جو مرمریں محلوں سے نکلتا ہے اور کھپریل کے چھپروں میں بسیرا ڈھونڈتا ہے اور جب میں نے سوچا کہ ذرا سی تاخیر بھی بہت بڑے اور بُرے نتائج کی ضامن ہو سکتی ہے تو میں جھلا کر اٹھا اور گھوڑی پر سوار ہو کر تھانے کو چل دیا مگر دور تھانے کی ڈالی بھجنگ عمارت کے غار ایسے بھیانک دروازے کے پاس مجھے زین خان اور اس کے عزیز تھانیدار کے پاس ہاتھ جوڑے کھڑے نظر آئے

ناکام و نامراد میں اپنے گاؤں کو چل دیا مجھے یہ محسوس تک نہ ہوا کہ لوگ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں اور سرگوشیاں کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ "سیدو اور سعید کا عشق بھی ہیر رانجھے کے عشق کی طرح زندہ رہے گا اور کئی ڈوم باز" ان کے قصے لکھیں گے ـــــ مولوی اسمٰعیل کی ناک کٹ کر کوڑے کے ڈھیر میں گر گئی ـــــ ہے ہے بے چارا مولوی اسمٰعیل!"

میں اصطبل میں پہنچا تو اوپر سے ابا جان آ گئے میں نے ان کے لبوں پر مسکراہٹ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ان پر مسکراہٹ کے بجائے کپکپاہٹ تھی وہ بولے:۔

"تم نے بہت بُرا کیا بیٹا! بہت بُرا کیا تم نے"

میں نے سر جھکا لیا چپ چاپ گھر آیا اور پلنگ پر گر پڑا۔ ایک

بات کیا ہے؟"

آسمان پر کوئی بدلی نہ تھی مگر مجھے ایک زہرہ گداز کڑک ضرور سنائی دی "سنبھل کر میں نے لاڈلے بیٹے کے حربے استعمال کرنا شروع کئے" جی پھر بتاؤں گا. آپ پانسو لادیں. کام ہو جائے پھر سب کچھ بتاؤں گا"

وہ بدستور مسکراتے رہے' وہ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے وہ غصے میں بھی ہوتے تو مسکراتے مجھے تو ان کی اس قوت یا کمزوری کا مدتوں سے تجربہ تھا

روپئے لے کر میں باہر لپکا اور چوپال پر جا نکلا چودھری حقے کی نَے پر باریک تار اور ریشم لپیٹنے والے کو جھڑک رہا تھا "ابے تان کر لپیٹ اپنی ماں تار کو ڈھیلا رہ گیا تو ایک ہی دن میں کیے کرائے پر تیری ماں پانی پھر جائیگا ریشم کو دانت سے مت کاٹ. تیری ماں قینچی منگائے دیتا ہوں ـــــ اور وہ زینو بھی تو اب تک نہ آیا کمبخت. قسم ہے، اگر آج وہ تیری ماں پانسو نہ لایا تو دھر رگڑوں گا اُسے. مجسٹریٹ تیری ماں اپنا آدمی ہے' میرے بیٹے سے اسکول کے دنوں کا یارانہ ہے' مجھے چچا جان کہتا ہے"

"چچا جان" میں نے چودھری کے قریب جا کر کہا "ایک بات سنیئے گا. ذرا ایک طرف ہو کر"

چودھری میرے ساتھ نہایت تپاک سے مصافحہ کر کے اٹھا جوتے گھسیٹتا مجھے ایک گوشے میں لے گیا اور بولا "تیری. . . " اپنے تکیہ کلام کو وہ جا اور بے جا مقامات پر استعمال کرنے کی تمیز رکھتا تھا اس لئے رک گیا اور پھر میرے شانے کو تھپکا کر بولا "کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے جی" میں نے کانوں کی گونج اور حلق کے زخموں سے بے پروا ہو کر کہنا چاہا "وہ زین خان آپ کا مقروض ہے نا"

"ہاں ہاں" وہ مجھے ایک چبوترے سے پتھر پر بٹھا کر بولا۔ "مدتوں کا مقروض ہے اور پھر آج تو اس کی لاڈلی کے خریدار بھی آ نکلے ہیں کہیں سے۔ بیچ ڈالے اسے، بیچنے کا مال ہے، سنبھالے رکھنے سے گھن لگ جائے گا اسے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

میرے کان شور کرنے لگے اور گلا رندھ گیا میں نے کہا۔ "وہ پانسو میں دے دوں گا آپ کو۔"

"تم؟"

"جی ہاں!"

"کب؟"

"اب"

"یعنی ابھی؟"

"جی ابھی!"

"کیوں تم نے خرید لیا شیدو کو؟ بڑا غضب کیا۔ لٹیا ہی ڈبو دی۔ لو بھئی اور سنو۔" چودھری اٹھ کر اپنے حواریوں کے قریب آ گیا۔ "اس میں پردے کی کونسی بات ہے۔ صاحبزادے نے زینو سے تیری ماں شیدو کا سودا چکا لیا ہے اب شیدو تیری ماں دلہن بن کر آئے گی بھائی مولوی اسمٰعیل کی حویلی میں چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل اسی کو کہتے ہیں۔"

لوگ مجھے گھورنے لگے۔ جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں کتنوں ہی نے جیچ بیچ سے ہمدردی جتائی۔ ایک نے کہا۔ "تو پھر چودھری۔ قرض بھر دوا۔"

ایلنگ پر بیٹھ کر بولا۔ "دیکھوں؟"

میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ وہ بقایا قرض میں ادا کرتا ہوں۔"
چودھری ہنسنے لگا۔ "لو بھئی، بالشتو تو میاں صاحبزادے ہی اٹھائے بیٹھے ہیں۔ پر میں یوں اکیلے بیٹھ کر رسید نہیں لکھوں گا۔ زینو کے سامنے ہوگا سارا معاملہ۔ میں تیری ماں کھری بات کہتا ہوں، کوئی برا مانے تو جائے بھاڑ میں۔ ہاں تو بھئی ذرا تیری ماں زینو کو پکار لانا۔"
ایک شخص زین خان کو بلانے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ چودھری پکارا۔ "رہنے دو بھئی رہنے دو۔ خود آرہا ہے۔ پہلے سے میاں صاحبزادے نے کہلوا بھیجا ہوگا۔"
زین خان کے چوپال پر آنے سے قبل ہی میں نے چودھری کو بتا دیا کہ میں محض زین خان کی غریبی سے متاثر ہو کر اس کا قرضہ ادا کرنے آیا ہوں۔ ورنہ مجھے نہ رشتے سے مطلب ہے نہ اور کسی قسم کا لالچ ہے۔ چودھری نے میری بات سن کر مونچھوں کو نچلے ہونٹوں سے ڈھانپ لیا اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "بات سمجھ میں نہیں آئی میاں صاحبزادے دودھ میں مینگنی سب کو نظر آجاتی ہے۔ لاکھ کوشش کرو چھپانے کی۔ مینگنی اوپر ہی ابھر آئے گی۔"
میں چودھری کے اس بھیجے انداز سے اندر ہی اندر کئی بل کھا گیا۔ اتنے میں زین خان آنکلا۔ اور پھر اس روز غریب بڈھے سے اتنی افواہیں وابستہ تھیں کہ چوپال پر اس کے قدم دھرتے ہی گاؤں کا گاؤں جمع ہو گیا۔
"ہاں تو کوئی انتظام کیا کہ تیری ماں چوکیدار کو تھانے بھیجا جائے۔" چودھری حقے کی نے پر نئے نئے لپٹے ہوئے تار پر انگلی پھیر کر بولا۔
گھبرایا ہوا زین خان ادھر ادھر دیکھ کر آگے بڑھا اور چودھری کے سامنے جھک کر آہستہ سے بولا "پردے کی بات ہے مالک۔"
چودھری ہنسا۔ چودھری کی ہنسی گاؤں والوں کے طویل قہقہوں کی بسم اللہ

تھی، دیر تک پتھر سے برستے رہے، اور سہما ہوا زین خان پیچھے ہٹ کر میرے قریب آگیا۔ "یہ لو پانسو۔" میں نے سرگوشی کی اور سب لوگوں کی نظریں بچا کر نوٹوں کا پلندہ زین خان کے ٹھنڈے ہاتھ میں گھسیڑنا چاہا۔ "تھام لو انہیں اور پھینک دو چودھری کے منہ پر۔ کمینہ بدذات۔"

لیکن زین خان کا ذہن ابھی میری اس عجیب و غریب قربانی کو گرفت میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چودھری بولا، "میاں زین خان۔ آج تو موقعہ بھی اچھا ہے، سنا ہے چند سوداگر بھی اُترے ہوئے ہیں تمہارے ہاں، اور پھر یہ بھائی تو مولوی اسمٰعیل کے صاحبزادے بھی تیری ماں حاتم کی قبر پر لات جمانے آئے ہیں۔"

کسانوں کی حیران نظریں مجھ پر تیروں کی طرح برس پڑیں۔ لیکن کر میں نے پانسو کے نوٹ چودھری کی جھولی میں پھینک دیئے اور کہا۔ "گن لیجئے انہیں اور حساب کتاب کر لیجئے زین خان سے۔ اب میرا اور زین خان کا معاملہ رہا کیا ادھار ختم۔"

مجمع دم بخود رہ گیا۔ چودھری ہنسا۔ مگر اب کے یہ ہنسی کسانوں کی سرگوشیوں کی بسم اللہ تھی۔ ایسی دبی دبی گونج اٹھی۔ جیسے دور کہیں گنجان جھنڈوں سے تیز ہوائیں گذر رہی ہوں۔

زین خان نے میری طرف دیکھا۔ کتنی گہرائیاں تھیں اُن خلیٰ کے دانوں ایسی جہاندیدہ آنکھوں میں کتنی حیرت محبت اور مسرت! — میں چپ چاپ کھڑا اپنا ایک ناخن کریدتا رہا۔

اور پھر جب گلی کے موڑ پر مجھے اپنے والد بزرگوار آتے نظر آئے تو آسمان میں شگاف ہوتے دکھائی دیئے اور زمین کا کلیجہ دھڑ دھڑ بجتا محسوس ہوا۔ دماغ کی

بے ہنگم چیخوں نے مجھے دیوار کا سہارا لینے پر مجبور کر دیا میری آنکھوں کے سامنے
اب شیدو کے بجائے لمبے لمبے ناگ تھے اور گلے میں ان گائے گیتوں کی جگہ بلوری
چوڑیوں کی کرچیاں!

جب اباجان نے چوپال پر قدم رکھا تو سرگوشیاں رک گئیں اور چودھری کی
جھولی میں پڑے ہوئے نوٹ انھی کی ران کے نیچے کھسک آئے۔ بہت دور
پورب کے اونچے پربت کے عقب سے گھنگھور گھٹا نے سر اٹھایا اور گرج کی بہت
مدھم آواز سنائی دی۔

وہ سیدھے میرے پاس آئے اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے "تم
نے بہت برا کیا بیٹا۔ بہت برا کیا تم نے میں شاید زین خان کو اس مصیبت میں
خود ہی مدد دیدیتا لیکن تمہاری یہ سوداگری مجھے ایک آنکھ نہیں بھائی"
آج ان کے لبوں پر بہت تلاش کے باوجود مجھے مسکراہٹ نظر نہ آئی۔

"کیسی سوداگری اباجان" میں نے پوچھا۔ اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔
"آپ کو غلط خبر ملی ہے، مجھے صرف زین خان کی غریبی اور بے کسی نے مجبور کیا۔ لوگوں
کا شک بالکل بے بنیاد ہے"۔

انہیں یہ یقین دلانے میں کافی جرأت سے کام لینا پڑا کہ میں شیدو کے
معاملے میں بالکل بے قصور ہوں۔ چند لوگوں نے بھی میری ہمنوائی کی۔ چودھری
نے بھی پانسو روپیوں کی حدت سے مجبور ہو کر ایک کلمہ کہہ دیا "نہیں جی صاحبزادہ
تو اللہ رکھے بالکل فرشتہ ہے"۔

اور جب اباجان بے دلی سے مسکرائے تو گھٹا سے کٹ کر اِدھر اُدھر
بکھرے ہوئے بادلوں نے ننھی ننھی بوندیاں برسانا شروع کر دیں۔ اباجان یہ
کہتے ہوئے چل دیئے "یہ بات ہے تو خیر کوئی حرج نہیں۔ زین خان میرا

بھائی ہے!"

مجمع منتشر ہونے لگا۔ چند لوگ چھپر تلے کھسک آئے۔ رنج سنگھ کو بلا کر رسیدیں لکھی گئیں۔ اور جب زین خان رسید کو چادر کے ایک پلّو میں اڑس کر جانے لگا تو میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ "چاچا وہ سوداگر کون ہیں کمبخت۔ تم نے انہیں اپنے گھر میں کیوں بٹھا رکھا ہے۔ کچھ جانتے بھی ہو لوگ کیسی کیسی بے پر کی اڑا رہے ہیں؟ کہتے ہیں کہ وہ شیدو کو خریدنے آئے ہیں۔"

زین خان کی چمکتی ہوئی آنکھوں پر آنسوؤں کی جھلّی چڑھ گئی۔ بولا۔ "ٹھیک کہتے ہیں بیٹا۔ لوگ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر تم نے آج مجھے نہ خرید لیا ہوتا تو سچ کہتا ہوں شیدو ہی! دنے پو نے خرید لی گئی ہوتی بھلا ہو ترا میں ابھی جا کر اُن مردودوں کو چلتا کرتا ہوں۔ کل سے حرامزادے حلوے مانڈے اڑا رہے ہیں۔"

وہ اپنے گھر کو چل دیا۔ میں نے اپنی حویلی کی راہ لی زبردست کامیابی کے ساتھ ساتھ ابا اور لڑکی کچھ سوچتی اور پوچھتی ہوتی نگاہوں کے خوف نے مجھے نہایت ہولے ہولے چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بھیگی ہوئی فضا میں امیدوں کی کتنی محلسرائیں تعمیر کیں کتنے انوکھے خواب دیکھے۔ کتنے راہ چلتوں کے سلام کا جواب جان بوجھ کر نہ دیا میں اپنے آپ پر مکمل اور بے داغ غنودگی طاری کرنا چاہتا تھا۔ غنودگی کے اس فردوسی لمحے کو میں چھونے ہی والا تھا کہ ناگاہ گاؤں کے وسط سے ایک شور اٹھا ۔۔۔۔ بالکل الجھا ہوا اور بے ہنگم شور لیکن آوازوں کی نوعیت کسی خوفناک خطرے کی ترجمان تھی میں پلٹ کر لپکا مسجد کے قریب مجھے اکبر ملا۔ میرے سوال کا انتظار کئے بغیر وہ بولا۔ "سوداگر شیدو کو اڑا لے گئے!"

"کیا؟" یہ لفظ میرے منہ سے چیخ بن کر نکلا

"شیدو اغوا ہو گئی!"

"کیسے"

"بس زین خان جب چوپال سے گھر کو پلٹا تو شیدو غائب تھی۔ سارا گاؤں چوپال پر جمع تھا۔ صرف چند بڑے بوڑھوں نے اُسے ایک گھڑ سوار کے آگے تڑپتے پھڑکتے دیکھا۔ اُس کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا اور اُن کے پیچھے ایک اور سوار تھا وہ ہوا کی طرح اُڑے جا رہے تھے"!

چیخ دھاڑ مچی ہوئی تھی۔ لیکن میرے حواس کا واویلا اس چیخ دھاڑ سے کہیں آگے نکل گیا۔ اکبر کو وہیں چھوڑ کر میں اپنے گھر کی طرف لپکا۔ اصطبل سے گھوڑی کھولی اس موقعہ پر صرف لگام کا تکلف ہی مناسب سمجھا۔ حویلی سے نکل رہا تھا کہ عقب سے اباجان کی آواز آئی۔ "سعید بیٹا۔ کہاں چلے"؟

"سعید میرے لال"۔ میری امی کی نحیف آواز آئی۔

بادل گاؤں پر جھک آئے تھے۔ ہواؤں میں جلا دینے والی خنکی تیر رہی تھی۔ اور کونجوں کی کرلاتی ہوئی ڈاریں سرمئی پس منظر پر غیر محسوس لکیروں کا تانا بانا تیار کر رہی تھی بہت نیچے بڑے راستے پر چند سوار اڑے جا رہے تھے اور زین خان کے گھر سے اٹھتا ہوا شور دبی ہوئی گونج بن کر رہ گیا تھا۔

بہت دور تک مجھے اباجان کی صدائیں سنائی دیتی رہیں مگر گھوڑی برق رفتار تھی اور میں بیقرار تھا پہاڑی راہ سے اُتر کر جب میں میدان میں آیا اور ایڑ لگائی تو چند لمحوں میں شیدو کے عزیزوں کے قریب سے گزرتا اتنی دور نکل گیا کہ یہ لوگ کلدار کھلونے سے بن کر رہ گئے!

ہوا میرے کانوں کے قریب ایک مسلسل اور پر سوز ساز بجاتی دیکی جا رہی تھی کبھی کبھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے رکابیں زمین کو چھو گئی ہیں ہلکی

ہلکی بوندیں بھی پڑ رہی تھی ۔ اور بادل کی بونچ گھوڑی کی تیز ٹاپوں میں تحلیل ہوئی جا رہی تھی۔

جب میں قصبے میں پہونچا تو معلوم ہوا کہ دو سوار کوئی ڈھ دو گھنٹے بیشتر نہایت تیزی سے دکھنی رستے پر اڑتے دیکھے گئے!

دو گھنٹے پیشتر! میں نے گھوڑی کی طرف دیکھا جس کے نتھنے پھڑک رہے تھے، اور جسم پسینے میں شرابور تھا۔ گھوڑی کو بڑے راستے سے ہٹا کر میں ایک غیر آباد قلعے کی طرف چل دیا کھیتوں کو پار کر کے اُسے ایک بیروٹے سے باندھا اور خود قریب ہی ایک چشمے کے کنارے جا بیٹھا۔

پانی گول اور سپید سنگریزوں پر بڑبڑاتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ ایک کمزور سی بدلی کی اوٹ سے سورج کی کرنیں نکل کر پانی میں ناچ رہی تھیں اور جنگلی بیلوں کا جال آس پاس پھیلتا ایک پھلاہی پر چڑھ کر پھر نیچے لٹک گیا تھا۔ پرلی طرف چڑیوں کے چند جوڑے نہا رہے تھے اور ایک شرمیلا ممولا ایک چٹان پر بیٹھا اُفق کی طرف دیکھ رہا تھا اچانک وہ اڑا اور آن کی آن میں کھیتوں پر سے ہوتا قصبے پر سے گذرتا گھٹاؤں میں گھل گیا۔

پھلاہی کے نیچے مجھے مکمل سکوت کی دیوی ملی زندگی اور اس کی رسیلی دھڑکنیں میرے دماغ کے مرکز میں جمع ہو کر ناچنے لگیں میں نے سوشلزم اور فاشزم کے نظارے پرکھے۔ میں نے پرانے رواجوں اور فرسودہ رسموں پر خیال آرائیاں کیں۔ زین خان اور چودھری کے سماجی تفرقے کا موازنہ کیا۔ سوداگروں اور محبت کرنے والوں کی دست درازیوں پر غور کیا اور جب بے بس اور بیکس شدید زخمی کبوتری کی طرح برق رفتار گھوڑے پر تڑپتی پھڑکتی دکھائی دی تو میں نے اپنی گھوڑی کی طرف دیکھا جس کا رنگ پسینے کی وجہ سے بدل گیا تھا

کے بعد کے طویل وظائف گنگنا رہے تھے اور امی دودھ بلونے کے بعد مکھن اکٹھا کر رہی تھیں۔

میں سیدھا اندر جا کر دھم سے ایک پلنگ پر گر گیا۔ موٹے موٹے مچھر کونے میں سرسرائے اور مخنی چکر کاٹتے دیوار سے چمٹ گئے۔ ایک چیونٹا پلنگ پر کسی غیر کا قبضہ محسوس کر کے نہایت تیزی سے بے ڈھنگے دائرے بنانے لگا۔

ـــــ بالکل اینڈے بینڈے دائرے ـــــ زندگی کے ان حقائق کے سے دائرے جن تک پہونچنے کے لئے اگر مذہب سیدھی راہ سجھاتا ہے، تو فلسفہ روڑا اٹکاتا ہے ـــــ اور پھر ندیاں اگر خط مستقیم میں بہیں۔ تو قدرت کا حسن لٹ جائے جمال کا کبریائی نظریہ سیدھے خطوط کا روادار نہیں، وہ قوس قزح ایسی نازک چیز میں میں بھی ایک خم ڈال کر ہی مطمئن ہوتا ہے۔

کڑوی کسیلی حقیقتوں کے وہ کانٹے جو جوانی اور محبت کے پھولوں تلے دبے رہتے ہیں میرے خیالوں میں چبھنے لگے۔ کئی محاذ قائم ہوئے اور ٹوٹ گئے۔ کئی مورچے بنے اور پھٹ گئے۔ اور آخر میرے قدم وحشیانہ اور مجذوبانہ تیزی سے بڑھے میں نے اپنے آپ کو بزرگ والد کے سامنے پایا۔ "ابا جان" میں نے اپنے آپ کو کہتے سنا۔ "ابا جان۔ اگر مجھے اس وقت ـــــ بالکل اسی وقت پانسو روپے کی ضرورت پڑ جائے، اور ضرورت بھی ایسی ہو جس کا پورا ہونا اور میرا زندہ رہنا ہم معنی ہوں تو آپ کیا کریں گے؟"

ابا جان تمام وظائف کے رس کو ایک لمبی چھو سے اپنے سینے پر چھڑک کر بولے "عجیب باتیں کرتے ہو۔ اگر کوئی ایسی ہی بات ہے، تو پانسو کیا پانچ ہزار لگا دوں۔ تم ہی تو میرا سب کچھ ہو۔"

راستہ صاف تھا۔ میں نے پانسو طلب کئے تو مسکرا کر بولے "لیکن آخر

چیونٹا غضبناک ہو کر چادر پر بے ڈھنگے چکر کاٹنے لگا اور پھر چند لمحوں کے بعد اپنی خاص رفتار اختیار کر کے اپنے ایک مردہ ساتھی کا جسم اٹھایا اور پلنگ پر سے اُتر کر ایک سوراخ میں گھس گیا۔

امی دروازے سے پیٹھ لگا کر رو رہی تھیں اور باہر ابا جان کہہ رہے تھے "میں نے پہلے بھی تجھے کئی بار کہا ہے بی بی کہ ہمارا لڑکا بڑا جلد باز ہے ہوا میں گرہ لگاتا ہے اب اس کی یہ حرکت دیکھی لعنت کا اشتہار لگا دیا میرے ماتھے پر برسوں کی محنت اور خدمت سے جو نام پیدا کیا تھا اس پر کیچڑ کے دھبے ڈال دیئے۔ گاؤں بھر میں چرچے ہو رہے ہیں"

مگر امی تو روئے جاتی تھیں اور خود میں رونے کی حدوں کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا دیر تک میں ذہن کی دھندلی خلاؤں میں بلبلے کھاتا رہا ایک بار پریشان ہو کر گھر سے نکلا تو لوگوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی "نے تجھے شید و کو؟" ——— "تم نے نہیں دیکھا نہیں؟" ——— "کہتے ہیں کانور میں منڈی سے عورتوں کی بیچ ڈالیں گے شیدو کو" ——— "اپنی مرضی سے تو نہیں گی؟" تنگ آ کر گھر لوٹ آیا تو امی نے دلاسہ دینا شروع کر دیا ابا جان کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہونے لگی لیکن یہ دلاسے اور یہ تبسم میرے سکون کا لٹا پٹا سرمایہ واپس نہ لا سکے۔

گھر کے دلاسوں اور باہر کے طعنوں سے تنگ آ کر میں نے ایمرجنسی کمیشن کیلئے خفیہ کوشش شروع کر دی اور جس روز مجھے بنگلور میں تربیت حاصل کرنے کیلئے فوری روانگی کا حکم ملا تو میں نے اس ضمن میں اپنی ساری کارروائیاں ابا جان کو بتا دیں وہ دیر تک خاموش بیٹھے سوچتے رہے اور پھر اٹھ کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اپنے طویل

وضائف کا رس چھو سے میرے سینے پر چھڑک کر فرمایا "فی امان اللہ"۔۔۔۔۔
اور پھر فرش پر بیٹھ کر وظائف میں مصروف ہو گئے۔
امی رونے لگیں ان کی جھریوں میں پھسلے ہوئے آنسوؤں اور مہربان آنکھوں میں ٹمٹماتی ہوئی التجاؤں نے مجھے کچھ دیر تک مذبذب رکھا مگر جب اباجان نے کہا۔
"خدا تمہیں کامیابی سے واپس لائے۔" تو امی جان نے بھی آنسو پونچھتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش صرف بجھتی ہوئی چنگاریوں کی سی تھرتھری بن کر رہ گئی۔
نو مہینے میں نے بنگلور میں کاٹے اور پھر چند روز گاؤں میں گزار کر میں مصر کو روانہ ہو گیا چار سال تک غیر مالوس ملکوں میں آگ اور لہو سے کھیلتا پھرا اور پھولی ہوئی لاشیں دیکھیں جن کے پیٹوں کو چھوتے ہی انکے منہ اور ناک سے لعفن بھرا لعاب بہہ نکلتا تھا خاردار تاروں پر جسم انسانی کے چیتھڑے لٹکے دیکھے لٹے ہوئے دیہات میں پریشان حال عورتیں دیکھیں جن کے ناکافی لباسوں سے چھن چھن کر آوارہ اور بے گھر جوانی سر پیٹ رہی تھی میں نے فضاؤں میں عزرائیل کو بموں کی صورتوں میں لپکتے دیکھا کیچڑ بھرے مورچوں میں باسی روٹیاں نگلیں حکومتوں کے بےنجر مطمئن رعایا کی آہوں کے زور سے فضا میں اچھل کر بڑی بڑی ہو گئے اور جب اتحادی فوجوں نے سسلی پر چڑھائی کی تو میں تین مہینوں کی رخصت پر گھر آ گیا بمبئی کی بندرگاہ پر اترا تو اگرچہ آسمان و زمین وہی تھے لیکن میرا زاویہ نگاہ وسیع ہو چکا تھا۔ ہر صورت جانی پہچانی نظر آنے لگی۔
لیکن اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے ذہن پر جمی ہوئی خون

کی تہوں میں جھرجھری سی پیدا ہوئی ہے کچھ گھبرایا مگر یہ ہنگامی گھبراہٹ تھی۔ میرے کاندھوں پر جھکتے ہوئے گراؤن مجھے ان فروعی معاملات کی طرف پلٹنے ہی نہ دیتے تھے۔

جب میں لالہ موسیٰ کے اسٹیشن پر پہونچا تو مجھے گاڑی بدلنا تھی میں نے سامان کو ویٹنگ روم میں رکھوایا اور پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا کچھ دیر کے بعد تھک کر میں نے پُل کے نیچے سیڑھیوں کے سائے میں پناہ لینی چاہی اچانک میری نظروں نے میرے خیالوں کو نہایت بھدی تختی دی۔ میرے سامنے رشیدہ بیٹھی تھی اس کے پاس ایک بچہ کھیل رہا تھا اور ایک ننھے کو وہ دودھ پلا رہی تھی ایک بدحواس چیونٹا اس کے دوپٹے پر دوڑ رہا تھا۔

عورت اور دوشیزہ کے تصورات آپس میں ٹکرا گئے میں نے ماضی کے سمندر میں الٹی زقند بھری حواس ڈولنے لگے اور کاندھوں پر جھکتے ہوئے گراؤن سیب کے بٹنوں میں بدل گئے۔

میں نے اس کے قریب جا کر کہا "رشیدہ"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ موٹی مگر بے رونق آنکھیں ــــ پتلے مگر پپڑیاں بھرے ہونٹ۔ گول مگر لکیروں بھرا چہرہ اُس کی پتلیوں میں ایک آتشیں چمک پیدا ہوئی۔ مجھے نہایت غور سے دیکھ کر وہ مسکرائی اور بولی "نوکر ہو گئے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں!"

"کب سے؟"

"جب سے تم نوکری پر گئیں!"

وہ شرما گئی۔ کھیلتے ہوئے بچے کے سامنے ایک بھدا سا کھلونا لڑھکا کر بولی۔ "کہاں رہتے ہو؟"

"سمندر پار"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"گھر"

"اچھے ہو؟"

"ہاں"

"خوش رہو۔"

میری خوفناک آنکھوں، بے رنگ چہرے، بے رس اور مختصر جوابوں سے گھبرا کر وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگی پلیٹ فارم کے آخری سرے تک نظریں دوڑا کر بولی۔ "بیٹھو" ——— اور ایک گٹھڑی سے مٹھی بھر کر کہنے لگی۔ "بیر کھاؤ گے؟"

میں نے بیر لئے، جو اس ٹھکانے پر آ رہے تھے، مگر پتلون کی تلوار کی دھار ایسی کہ ریز بیٹھنے نہیں دیتی تھی اچانک ایک چھیلا دہقان میرے قریب آیا اور بولا "کیا ہو رہا ہے کرنیل صاحب؟"

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں"، میں نے جاتے ہوئے کہا۔ "یونہی رُک گیا تھا۔ سائے تلے!"

اور مجھے عقب سے قہقہوں میں لپٹی ہوئی اس کی آواز سنائی دی "ایسے چیونٹوں کو بھی سرکار بھرتی کر لیتی ہے۔ شیدو، دیکھ تو چلتا کیسے ہے ——— جیسے چھالے پڑے ہوئے ہیں پاؤں میں ———!"

پھنکارتے اور دھاڑتے ہوئے انجن نے مجھے اپنی طرف بلایا۔ مگر

میرے کاندھوں سے چمٹے ہوئے کراؤن چمک کر پکارے "تم کرنیل بنو گے۔ تم کرنیل بنو گے۔"

ایک نوجوان بھکارن کی جھولی میں بیروں کو ٹھونس کر میں وِیٹنگ روم کی طرف لپکا اور ایک کرسی میں گر کر بیرے کو آواز دی "میں ابلتی ہوئی چائے کے آٹھ دس پیالے پیوں گا۔"

اور پھر اسٹیشنوں پر سنکھیا تو بکتا ہی نہیں۔

خربوزے

وہ تھکا ماندہ روتا بسورتا سو گیا۔ اور سوتے میں اُس نے ایک خواب دیکھا کہ آسمان کے ستارے ہولے ہولے خربوزوں کی شکل اختیار کر رہے ہیں اور یہ آسمانی خربوزے جھم جھم کرتے اُس کی جھولی میں آگرتے ہیں. خود کٹ جاتے ہیں بیج خود ہی الگ ہو جاتے ہیں. خود اُس کے منہ میں اپنا گودا تراش کر ڈال دیتے ہیں اور چھلکے اچھل کر خود ہی پرے جا گرتے ہیں اور اُس کی ماں جس نے شام سے اس وقت تک چیخنے چلانے کے باوجود اُسے ایک خربوزے کیلئے دو پیسے نہیں دیئے تھے، کوڑا کا سہارا لئے بیٹھی مسکرا رہی ہے! اور اُس کے ہم جولی پست دیوار پر سے اپنے گرد آلود سر اٹھا کر اُسے تعجب اور رشک سے دیکھ رہے ہیں کہ اچانک ایک خربوزہ اُس کے سر پر آن گرا اور وہ بلبلا کر اُٹھ بیٹھا ــــــ

ہائے ماں ـــــ خربوزہ" ـــــ اور اس کی ماں اچانک نیند سے چونک کر پکاری "دیتر ے دشمنوں کو موت بلا ئے تو کیا ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے، یہ اللہ مارے خربوزے کیا آئے میرے لئے آفت آگئی ـــ چند روز ہوئے تجھے ایک گول گول پیلا پیلا خربوزہ نہیں خرید دیا تھا؟ سو جا"!

اور اس نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر آنکھیں جھپکا کر آسمانی خربوزے دیکھنا چاہے مگر بوڑھی بکری کے مدھم دھبے اور کبڑے نیم کے چپ چاپ سائے کے سوا اُسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس پر اُسے خربوزے کا گمان ہو سکتا!

ساری رات اُسے خربوزوں بھرے خواب نظر آتے رہے اور جب صبح کو اٹھا تو آنکھیں ملتا اپنی ماں کے پاس جا بیٹھا اور اُس کے اُٹھے ہوئے گھٹنے پر اپنی ننھی سی ٹھوڑی رکھ کر مسکین آواز میں بولا۔ "ماں!"

اور وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی "کیا؟"

"خربوزہ" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور اس کی حقیقی ماں کی آنکھیں سوتیلی ماؤں کی آنکھوں کی طرح چمک اُٹھیں اس نے ہونٹ کاٹ کر ننھے کے گال پر اُلٹے ہاتھ سے اس زور سے طمانچہ مارا کہ وہ لڑھک کر چولھے کے پاس جا گرا۔ زار و قطار روتا وہ اپنے گھر سے باہر نکل گیا اور سوچنے لگا "اس دنیا میں پہلے سے ہی میرا باپ نہ تھا اب میری ماں بھی کوئی نہیں۔ میں تو کوئی آوارہ بھکاری چھوکرا ہوں، جس گلی میں جاتا ہوں کتے کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں اور جس سے بات کرتا ہوں وہ تیوری چڑھا لیتا ہے، بس اب آج کے بعد گھر نہیں جاؤں گا ان کھیتوں سے نکل کر بہت دور چلا جاؤں گا۔ وہ جہاں اُڑتی ہوئی کونجیں چڑیاں سی نظر آتی ہیں، جہاں ریلیں اور لاریاں چلتی ہیں بس وہاں ـــ نہ کسی سے کچھ مانگوں گا نہ کسی

کی چوری کروں گا دن کو چلتے چلتے تھک جاؤں گا۔ تو شیشموں تلے لیٹ رہوں گا رات کو تھکوں گا تو نرم گھاس کے قطعوں پر سو رہوں گا ماں کہا کرتی ہے کہ ہم سب کو رزق دینے والا خدا ہے۔ بس اُسی سے مانگوں گا وہی میرا پیٹ بھرے گا اور وہی ـــ وہی خربوزے بھی لا دے گا" ـــ اور خربوزوں کا خیال آتے ہی وہ رُک گیا۔ بھیگی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلی سے ملکر اس نے ہاتھ بلند کئے اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اے میرے اچھے خدا۔ میں تجھے بہت یاد کیا کرتا ہوں۔ پرسوں مولوی جی سے میں نے نماز کا سبق بھی لیا تھا اور مجھے کلمہ بھی آتا ہے اور میں بہت اچھا ہوں اچھے خدا۔ اور تو یوں کر کہ مجھے آج اچھے اچھے پیلے پیلے خربوزے لا دے کہیں سے، اور نہیں تو یہ سامنے بخشو کا کھیت، ہے یہیں سے سہی۔ لیکن خربوزے لا دے ضرور۔ میں آج ساری رات کلمہ پڑھتا رہوں گا اور پھر خربوزے تم مانگوں گا میرے اچھے خدا! اب میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو میرے سامنے خربوزے رکھ جا لے۔"

اور اُس نے وہیں کھڑے کھڑے آنکھیں بند کرلیں اسے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اُس کے لبوں کے گوشے کانپنے لگے۔ نتھنے پھڑک گئے اور وہ مسکرانے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اللہ میاں اس کے لئے خربوزوں کی گٹھڑی باندھے آرہے ہیں قدموں کی چاپ نہایت تیزی سے قریب آرہی تھی اُس کے ذہن پر اللہ میاں کا پاکیزہ ہیولیٰ اُبھرا۔ سفید لباس، سفید بال نورانی چہرہ، ایک سفید کپڑوں میں پیلے پیلے خربوزوں کا ایک انبار باندھے وہ اُس کے قریب آئے اور پھر ـــ اور پھر تڑاخ کی آواز آئی۔ اس کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ دھب سے نکیلے پتھروں پر گر گیا۔ سکتہ چھا گیا بے چارے پر پلٹ کر دیکھا تو اللہ میاں کی جگہ سفید لباس پہنے سفید ریش بخشو کھڑا

ہانپ رہا تھا اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں اور پریشانی میں وہ اپنی داڑھی کو بار بار کھجلاتا تھا۔ گرج کر بولا۔ "شیطان کہیں کا۔ مجھے دیکھ کر آنکھیں بند کر کے یوں چپ چاپ کھڑا ہو گیا جیسے اسے کچھ خبر ہی نہیں۔ یوں کھیت میں گھسا آ رہا تھا جیسے اپنے باپ کی ریاست میں اینڈتا پھر رہا ہے شیطان کہیں کا!"

ننھا، جو خدا اور بخشو کے اس ہولناک تصادم سے گھبرا سا گیا۔ رونی صورت بنا کر بولا۔ "میں تو خربوزوں کی ــــ"

اور بخشو اسکی بات کاٹ کر کہنے لگا۔ "اور میں کب کہتا ہوں کہ تو یہاں نماز پڑھنے آیا۔ خربوزوں کی تلاش ہی تو تجھے یہاں کھینچ لائی۔ گزشتہ چند دنوں سے میں سوچ رہا تھا کہ وہ چور کون ہے جس نے میرے کھیت کا پورا بیگھ تباہ کر ڈالا ہے اب معلوم ہوا کہ یہ حضرت ہیں۔"

اور وہ روتا ہوا بولا۔ "میں تو آج ہی ــــ"

"اور کل؟ اور پرسوں؟" بخشو نے اپنا سر دائیں کاندھے پر جھکا کر کہا "کل پرسوں میں نے تجھے نہیں دیکھا، اس لیے؟ اٹھ بھاگ جا یہاں سے آج کے بعد اگر تو ادھر آیا تو نکال جاؤں گا تجھے۔ بڑا آیا خربوزوں کا رسیا۔ اتنا شوق ہے تو ماں سے دو پیسے لے اور خرید لے جا خربوزہ۔"

ننھا اٹھا۔ اٹھتے ہوئے اس کی نظریں سامنے سارے کھیت میں گھوم گئیں اور بے شمار پیلے پیلے دھبے اُن کے سامنے تیرتے ہوئے کہیں کھو گئے۔ سر جھکائے وہ پلٹا اور بہت دور جا کر ایک ننھی سی بیری کے تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اس دنیا میں نہ تو اس کا کوئی باپ ہے اور نہ ماں۔ اور نہ ــــ اور نہ خدا ــــ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں اور وہ سسکیاں

بھرتا ہوا وہیں سو گیا۔
بہت دیر تک وہ خربوزوں بھرے خواب دیکھتا رہا پھر اچانک جیسے
اُس کے منہ پر اللہ میاں نے طمانچہ مار دیا۔ ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ دیکھا تو ماں کھڑی
ہانپ رہی ہے بڑی بڑی لال آنکھیں پسینے سے شرابور چہرہ پاؤں پر گرد جمی
ہوئی ہاتھ دوسرے طمانچے کے لئے تلا ہوا۔ لگاؤں دوسرا؟ وہ پکاری "ارے نگوڑے
گھر چلے گا؟ ارے اُچکّے۔ تو بخشو کا کھیت اجاڑ رہا ہے اور پھر بھی ہر وقت خربوزہ
خربوزہ کی رٹ لگائے رکھتا ہے ارے چوٹّے تجھے شرم نہ آئی؟ اللہ بخشے
تیرے باپ کو تو ایک روز پانچ روپے کا ایک نوٹ گلی میں پڑا ملا تھا۔ بھاگا بھاگا
چوپال پر گیا۔ پوچھ گچھ کی اور جس کا نوٹ تھا اُسے دیدیا ایک کوڑی تک نہ
لی گھر لے آتا تو بھیڑ بکری خرید لی جاتی۔ لیکن اُس کے من میں کھوٹ نہ تھا اور
تو ایسا ناخلف ایسا کپوت کہ خربوزے چراتا پھر رہا ہے زبان کا چسکا پورا کرنے
کے لئے خاندان بھر کے نام کو بٹہ لگا رہا ہے۔ بخشو ابھی ابھی میرے ہاں گیا اور
اتنے آدمیوں کے سامنے میری ناک کاٹ کر رکھ دی ــــ"

ماں کی کف آلود ڈانٹ ڈپٹ کا سلسلہ جاری رہا لیکن ماں کی ناک
کٹ جانے کی خبر سن کر اُس نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔ ماں کی ناک اسی طرح
قائم تھی اُسی طرح لمبی اور جھکی ہوئی اور پھر اُسے وہ سوراخ بھی نظر آ گیا۔ جو
شاید بچپن میں بلاق ڈالنے کے لئے نکالا گیا تھا وہ حیران تھا کہ اس کی ماں
بھی عجیب ہے اُس پر ایک جھوٹا الزام دھر رہی ہے اور خود اتنا بڑا جھوٹ
بول رہی ہے!

"ارے چلتا ہے گھر یا ـــ" ماں کا ہاتھ اور بلند ہو کر تن گیا۔ انگلیاں
لوہے کی سلاخوں کی طرح اکڑ گئیں۔ وہ اٹھا اور ہولے سے بولا "چلتا ہوں۔"

"چل میرے آگے"۔ ماں نے اُس کی گردن کو اپنے پنجے میں جکڑ لیا اور جب وہ بخشو کے کھیت کے قریب سے گزرا تو اُس کی آنکھوں کے سامنے پیلے پیلے تارے سے تیرنے لگے جو آہستہ آہستہ رنگ بدلتے گئے اور جب وہ گھر پہنچا تو وہ تارے صحن میں پڑے ہوئے کنکروں میں تبدیل ہو گئے!

گھر آ کر ماں نے اسے دلاسا دیا۔ کھانا کھاتے ہوئے نون مرچ کے علاوہ اُس کے سامنے گڑ بھی تھا ماں اُسے پنکھا بھی جھلتی رہی اور یہ بھی کہا تو تو میرا سب کچھ ہے، تو ہی میرا دھن دولت ہے تجھی کے سہارے تو میں جی رہی ہوں ورنہ کب کی کسی گھاٹی میں چھلانگ لگا گئی ہوتی تو بڑا ہو گا نوکر ہو جائیگا فوج میں ـــــ"

"میں تھانے میں سپاہی بنوں گا"۔ اس نے لقمہ چباتے ہوئے ہونٹ لٹکا کر کہا۔

"ہاں ہاں" ماں مسکرا کر بولی "میرا ننھا تھانے کا سپاہی بنے گا۔ سر پر لال پگڑی ہاتھ میں ننھی سی چھڑی پاؤں میں کالے بوٹ جدھر جائیگا لوگ زمین پر بچھتے جائیں گے۔ اور پھر میرا لال چھٹی پر آئے گا تو میرے لئے اچھی اچھی چیزیں لائے گا ریشمی کپڑے اور مٹھائیاں اور ـــــ"

"اور خربوزے بھی ـــــ" اُس نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا ماں کے چہرے کی جھریاں گہری ہو گئیں اور پھر وہ بولی "ہاں خربوزے بھی"!

اور ان باتوں کے دوران میں ننھا سوچتا رہا کہ ماں اس وقت بہت مہربان معلوم ہوتی ہے اب میری ماں سچی ماں کے روپ میں ہے کیوں نہ میں اسے ایک خربوزہ لانے کے لئے کہہ دوں لیکن اُس کی نظریں اچانک اپنی ماں کے سوکھے ہوئے ہاتھ پر جا پڑیں جس کی انگلیاں لوہے کی سلاخوں کی طرح

اکڑی ہوئی تھیں ۔۔۔ تھوک نگل کر چپکا ہو رہا!

لیکن خربوزوں کا بھوت اُس ننھے سر پر اُسی طرح سوار رہا کئی بار ارادہ کیا کہ ماں کو ایک خربوزے کے لئے کہہ دے۔ پرسوں ذیلدار جی کے گھر کی بچی بلبس کر ایک آنہ لائی ہے کیا اُن چار پیسوں میں سے وہ ایک پیسے کا بھی حقدار نہیں۔ آخر اُس کا پیسا ہوا آٹا اکٹھا کر دہی تو ذیلدار جی کی بیٹی کو دے آیا تھا اور اگر یوں نہیں تو کیوں نہ وہ بخشو والے جھوٹے الزام کو بیچ کر دکھائے چپکے سے گھس جائے کھیت میں اور اتنے خربوزے کھائے کہ ساری عمر اُسے خربوزوں ہی کی ڈکاریں آتی رہیں۔ لیکن یہ سب کچھ سوچنے کے بعد اچانک اُس کے دماغ میں ماں کا اکڑا ہوا ہاتھ کلبلانے لگتا اور اُس کے سارے ارادے ننھے ننھے ذرے سے بن کر ہواؤں میں کھو جاتے،

ایک روز وہ ایک گلی میں خربوزوں کے چھلکے دیکھتا گزر رہا تھا کہ اُسے ذیلدار جی کی آواز سنائی دی "اے ننھے ادھر آ"۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے کئی ہم عمر چوپال پر اکٹھے تھے آنکھیں جھپکاتا وہ ذیلدار جی کے پلنگ تک گیا اور بولا "جی با!"

ذیلدار جی بولے "ہمارا بھوسا آیا ہے آج۔ اُس کوٹھے میں پڑا ہے تم سب لڑکے اسے اچھی طرح لتاڑو گے تاکہ وہ نیچے بیٹھ جائے اور بھوسے کا ایک اور بورا بھی کوٹھے میں آسکے، دو دو پیسے ملیں گے تم سب کو لتاڑو گے لتاڑوں گا۔ دہ لتاڑوں گا۔" ننھا بولا اور ہر طرف خربوزوں کا موسلادھار مینہ برسنے لگا

سب لڑکے اندھیرے کوٹھے میں گھس کر بھوسے پر چڑھ گئے بہت دیر تک کودتے ناچتے رہے، بھوسے میں سے مہین دھول نکل کر اُن کے بالوں کانوں، آنکھوں، ناک اور منہ میں گھستی رہی مگر دو پیسوں کا جادو انہیں اسی

شدت سے ناچتا رہا. کسی کو ریوڑیاں یاد آ رہی تھیں تو کسی کو پیپرمنٹ کوئی مصالحہ دار گڑ کے خواب دیکھ رہا تھا کوئی رنگ برنگے پتنگوں کے. لیکن صرف ایک دماغ میں خربوزے لڑھک رہے تھے قدموں کی ہر دھمک کے ساتھ کوئی اُس کے کان میں کہتا. "خربوزہ"!

اور وہ جی ہی جی میں خوش ہو کر جی ہی جی میں کہتا "خربوزہ نہیں تو کیا ریوڑیاں دانت ٹوٹ جاتے ہیں چباتے چباتے. اور پیپرمنٹوں سے کچی کچی بدبو بدبو آتی ہے اور مصالحدار گڑ میں مصالحے کی جگہ مکوڑے پڑے ہوتے ہیں. اور پتنگ ایک جھٹکے سے کٹ جاتے ہیں کمبخت. ہم تو خربوزہ خریدیں گے باہر سے پیلا اور اندر سے سبز۔ ایک ایک پھانک میں لاکھ لاکھ مزے"!

بہت دیر تک وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا. کودتا رہا. ناچتا رہا. اور مہین دھول اُس کی آنکھوں اور نتھنوں اور گلے میں گھستی رہی اور آخر جب ذیلدار جی مطمئن ہو گئے کہ بھوسا اس سے زیادہ اور نہ دب سکے گا تو سب ننھے ننھے بھتنوں کی طرح باہر نکلے. دو دو پیسے سب کی ہتھیلیوں پر رکھے جانے لگے. ننھا سب سے آخر میں تھا. وہ جونہی ہاتھ پھیلائے ذیلدار جی کے قریب آیا اور انہوں نے جیب سے ہاتھ نکالا تو وہ مٹھی بند کر کے کلیلیں بھرتا چوپال سے بھاگ نکلا۔ "ارے ننھے پیسے تو لیتا جاتا". ذیلدار جی ہنستے ہوئے بولے آخر اُس نے رک کر مٹھی کھولی تو وہ خالی تھی. اُسے ذیلدار جی بڑے سست اور نالائق معلوم ہونے لگے جنہوں نے دو پیسے نکال کر ہتھیلی پر رکھنے میں تین گھنٹے لگا دیئے تھے!

واپس آ کر اُس نے ذیلدار جی سے پیسے لئے مگر اس کا ہاتھ کانپ گیا اور پیسے نیچے گھوڑے کی لید میں گر گئے نہایت پھرتی سے اُس نے لید سے

پیسے اٹھائے اور ڈھلوان پر سے بڑھکتے ہوئے کھلونے کی طرح خربوزوں والے شاموں کی دکان کی طرف لپکا!

دُور سے شاموں کو پکارا "چاچا شاموں ایک خربوزہ دو پیسے کا ایک اچھا سا پیلا سا خربوزہ"۔

اور جب وہ چاچا شاموں کے قریب پہنچا تو خربوزہ منتخب ہو چکا تھا۔ دو پیسے شاموں کے آگے پھینک کر وہ خربوزے کو بغل میں دبائے گھر کی طرف دوڑا ایک جگہ اُس نے ٹھوکر بھی کھائی اور گرتے گرتے بچا حلق پر جمی ہوئی دھول تیز تیز سانس لینے کی وجہ سے چیں چاں بجنے لگی۔ گھر کے صحن میں قدم دھرتے ہی پکارا "ماں! —— خربوزہ"۔ اور اس کا حلق فرطِ مسرت سے گھٹ گیا! —— "خربوزہ" وہ ایک بار پھر چلایا۔

اندر سے آواز آئی "پھر وہی خربوزہ؟ تیرا باپ دے گیا ہے مجھے خربوزے کہ تُو —— ارے! خربوزہ!"

اور ماں نے بڑھ کر خربوزہ اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر گھمایا۔ "کہاں سے لایا؟"

ننھے نے جب ماں کو سارا حال کہہ سنایا تو وہ بولی "پیسے گھر لے آتا تو اچار خرید لیتے جو دس دن تک چلا جاتا۔ مگر خیر تجھے شوق تھا۔ شکر ہے تیرے من کی آگ تو ٹھنڈی ہوئی لے ذرا چھری اٹھا لا —— چولھے کے پاس پڑی ہوگی۔"

ننھا کودتا پھاندتا چولھے کے پاس گیا۔ چھری کے دھوکے میں دستِ پناہ اٹھا لایا۔ رستے میں پلٹ کر دست پناہ وہ پھینکا اور چھری اٹھا لی ماں کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ چھری خربوزہ پر جھکی اور جب اُس کی نوک خربوزے کے کلیجے میں داخل ہونے لگی تو ماں بولی "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵" اور جی ہی جی میں ننھے نے بھی تین بار بسم اللہ شریف پڑھی۔ اور پھر ——

پھر دونوں ٹکڑے الگ ہو گئے اور پانی کی ایک ننّھی سی نہر فرش پر بہنے لگی۔ بدبو سے دونوں کے دماغ پھٹنے لگے۔ خربوزے کا دونوں گودا پانی بن چکا تھا اور بیج کالے رنگ کے ہو گئے تھے اور چھلکے پر لمبے لمبے سفید رنگ کے کیڑے بل کھا رہے تھے خربوزے کو فرش پر پٹخ کر ماں نے انگلیوں کی پانچ سلاخوں سے ننھے کے گال پر اس زور کا طمانچہ مارا کہ وہ لڑھکتا لڑھکتا دیوار کے قریب جا رُکا۔ چھلکے بوڑھی بکری نے بھی قبول نہ کئے!

وہ روتا بلکتا سو گیا۔ اور جب صبح کو اُٹھا تو اُس کے گلے میں "پیں چاں" سی ہو رہی تھی۔ اور اُس کے بدن سے آگ کے شعلے اُٹھ رہے تھے۔

اور خربوزے کے چھلکے سے کالے کالے لمٹنگے کیڑے چمٹ رہے تھے اور بخشو کے کھیت میں —— ہر طرف پیلے پیلے دھبے سے ناچنے لگے وہ چیخ مار کر تڑپا اور کھٹولے سے نیچے آ رہا۔

نامرد

چاندنی رات مکمل سناٹے کے بغیر میرے نزدیک ایک نہایت دھندلا نقشہ ہے جس کے رنگ دھو دیئے اور گرد نے چوس لئے ہوں۔ دن بھر کی چیخم دھاڑ اور ہائے ہائے کے بعد بھی اگر زندگی کا بھوت اپنے بے ہنگم رقص اور چیختے چلاتے گھنگھروؤں سے چاندنی کی صاف سطح پر چرکے لگاتا پھرے، تو پھر اس چاندنی سے وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا بھلا جس میں دل کی دھڑکنیں ہتھوڑے کی چوٹیں بن کر بجتی ہیں نصف شب کے سہمیں سناٹوں میں مجھے نہ تو کوئلی کی کراہیں پسند نہ پپیہے کی ہچکیاں۔ آواز چاندنی کی لطافت پر چھا جاتی ہے۔ اور چاندنی پر چھا جانے والی آفتوں سے تو ہر وہ انسان نفرت کرے گا۔ جو چاند کے دودھیا اجالوں میں نہایا ہوا اور نقرئی کرنوں کی بے آواز پھواروں میں بھیگتا پھرا ہو۔

اُس شام کو، جب میں سامان باندھ کر تیار ہو بیٹھا۔ اور امی میری ہتھیلی پر شکر رکھ کر میری بخیریت واپسی کے لئے آنسوؤں کی سیلن سے ٹھٹھری ہوئی دعائیں مانگ چکیں۔ تو حویلی کے باہر مجھے گھنگھروؤں کی آواز سنائی دی جس میں ایک گھنٹی کی ٹنٹناہٹ بھی رینگ رہی تھی۔ اچانک ہش ہش کی مسلسل آوازوں سے چونک کر امی جان بولیں "اونٹ آگیا میرے لال اب سامان رکھوائے تسلی سے، اور پھر اللہ کا نام لے کر چل دیجئے۔ دیر ہو گئی تو کل سارا دن اسٹیشن پر بیٹھنا پڑیگا۔ گاڑی صبح کی اذان ہوتے ہی نکل جاتی ہے"۔

مشکل یہ تھی کہ کجاوے کے ایک طرف تو مجھے بیٹھنا تھا۔ دوسری طرف توازن قائم رکھنے کیلئے سوٹ کیس اور بستر ٹھونس دیئے گئے۔ تجربتہ میں ایک طرف بیٹھا تو سامان والا حصہ اوپر اٹھ گیا اور اونٹ نے بلبلا کر اپنی دم کو اس تیزی سے ہلایا۔ جیسے اس میں بجلی کی رو حلول کر گئی ہو۔ نتھنے پھڑکا کر اس نے گردن موڑی اور میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "سنبھل کر بیٹھو بچہ جی۔ تمہارے حصے کے کجاوے کی چولتیں ہماری پسلیوں میں گھس رہی ہیں۔ سنبھل کر بیٹھو۔ ورنہ ہمارے گُنوں سے تو تم واقف ہی ہو۔ ہم نے کروٹ لی۔ تو چُرمُر ہو کر رہ جاؤ گے"۔

اونٹ کی ہدایت معقول تھی لیکن بوڑھا ساربان نورا میرے کچھ کہنے سے قبل ہی ایک بھاری پتھر اٹھا لایا۔ اور بستر کے ایک طرف جما کر بولا "اب بیٹھیے"۔ میں اونٹ کے چکنے جسم پر پاؤں جما کر دوبارہ کجاوے میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ عقب سے آواز آئی "سلیم میاں"۔

یہ بوڑھا باوا تھا۔ جس کی جھریوں میں پسینے کی لکیروں اور دھندلی آنکھوں پر جھکے ہوئے ابروؤں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دور سے آرہا ہے

اور تیزی سے آرہا ہے اور کسی ضروری کام سے آرہا ہے۔ میرے قریب آکر بولا۔ اسٹیشن کو چلے ہو نا سلیم میاں۔ ابھی ابھی مجھے ایک لڑکے نے بتایا کہ سلیم میاں نے اونٹ لیا ہے بھاڑے پر۔ تو بیٹا۔ بات یہ ہے کہ میاں ڈالی جیل میں ہے نا میرا بیٹا اللہ داد، دو سال ہوئے وہ ایک بلوے میں ــــ"

میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں۔ چچا بادو، اُسے پانچ سال قید کی سزا دی تھی"

بادو نے اپنے جبڑے کو پوری طرح کھول دیا۔ "شکر ہے تم غریبوں کو یاد تو رکھتے ہو سلیم میاں۔ اچھے باپ کے بیٹے ہو نا۔ خدا بخشے تمہارے ابا سے میرا بڑا گہرا یارانہ تھا۔ ایک دفعہ چکوال سے میرے لئے ریوڑیوں کی ایک گٹھڑی لے آئے۔ کہتے تھے یہ ریوڑیاں کڑ کڑ بھی بولتی ہیں اور رس بھی گھولتی ہیں اور ــــ"

حویلی کے کواڑ کے پیچھے سے امی کی آواز آئی۔ "بیٹا دیر ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "چچا۔ تم بھاڑے کے اونٹ کی بات کر رہے تھے۔"

وہ باچھوں کو کانوں تک لے گیا اور اپنے ٹھنڈے آسیبی ہاتھ سے میری کلائی کو جکڑ کر بولا۔ "تو میرا لڑکا جیل میں ہے نا۔ بہو اس سے ملاقات کرنے جا رہی ہے۔ ساتھ دو اڑھائی سال کا ننھا بھی ہے۔ میں نے کہا سلیم میاں اکیلا ہی تو ہے کجاوے کے ادھر سلیم میاں بیٹھ جائیگا ادھر بہو رانی بیٹھ جائیگی ننھے کے ساتھ۔ بیچ میں آجائیگا سامان ــــ اور آدھا کرایہ ابھی دیئے دیتا ہوں۔"

میں امی کی رائے پوچھنے کے لئے بولا۔ "امی؟"

کواڑ کے پیچھے سے آواز آئی۔ "کیا حرج ہے اور کرائے کی کیا ضرورت ہے بادو اپنا بھائی ہے۔"

"تیرہ پردہ قائم رہے ہاں"۔ ہادو نے چادر کے کونے کی ادھ کھلی گانٹھ
کو مضبوط کر کے ایک طرف اڑس لیا اور پلٹ کر ہانک لگائی۔ "لاڈلی"۔
ایک عورت چھم چھم کرتی نکڑ پر ظاہر ہوئی۔ اُس نے سارا جسم کالی چادر میں
لپیٹ رکھا تھا اور شاید بچہ بھی کہیں چادر ہی میں تھا۔ اس سیاہ شکنجے میں
اُس کا جسم پھڑپھڑاتا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے شکاری کی کسی ہوئی تھیلی میں اچھلتے
ہوئے خرگوش، سادبان بھی اس مسئلے کے اتفاقی حل سے بہت مطمئن معلوم
ہوتا تھا۔ فوراً اسامان کو درمیان میں باندھا میں حویلی میں جاکر اپنے ماتھے پر
امی کے ہونٹوں کا سکون بخش مس لئے باہر آیا۔ لاڈلی اور میں ایک کجاوے
میں بیٹھ گئے۔ ہادو نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اونٹ نے لٹکتے ہوئے ہونٹوں
کو پھڑپھڑایا۔ جیسے اطمینان کا اظہار کر رہا ہے کواڑ کے عقب سے عربی دعاؤں کی
سرسراہٹیں نکل رہی تھیں۔ اور یادھر یادو پکار رہا تھا۔ "فی امان اللہ۔ خیر سے
جاؤ، خیر سے آؤ۔ لاڈلی بیٹا سویرے سویرے ملاقات ہو جائے تو تیرا چچا نورا
ہی تجھے لیتا آئے گا واپس۔ کیوں نورے؟"
میں نے جلدی سے کہا۔ "لیتا آئے گا۔ لیتا آئے گا۔ آخر اسے واپس ہی
تو آنا ہے۔ پل بھر رُک جائے گا۔ سیر کرلے گا بازار کی۔"
"پہلے بھاڑا چکا تو چچا۔" نورا بات کا کھرا سہی مگر مجھے اُس کی یہ جلد بازی
اور بنیاپن برا لگا۔ میں نے ذرا سختی سے کہا۔ "بھاڑے کی فکر نہ کرو۔"
اور پرلی دیوار سے لگ کر کھڑے ہوئے چند گبروؤں نے سارسوں کی
طرح گردنیں بڑھا بڑھا کر کچھ ایسی سرگوشیاں کیں، جیسے انہیں شربت کے مٹکے
میں سانپ رینگتا نظر آ گیا ہو۔
اونٹ کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز بے ڈھنگے سہی، مگر صعود و قعود کی شاہراہوں

پر ایسے کئی موڑ آتے ہیں' اونٹ اُٹھا۔ ایک پل کیلئے جم کر رہ گیا۔ جیسے پرسکون سفر کی دعا مانگ رہا ہو' اس کے بعد جسم کو بھدّی سی حرکت دی جیسے توازن کا اندازہ لگا رہا ہو۔ دُم کی برقی لہریں جاگ اٹھیں۔ اس کے ہونٹ پھر پھڑائے اور پھر چلا ہی تھا کہ میں پکارا "بھئی نورے یہ گھنگھرو اُتارے اور گھنٹی کس کر باندھ دے اونٹ کی گردن سے' خدا جانے تم لوگ یہ حرکتیں کیوں کرتے ہو اچھے خاصے سفر کا ستیاناس کر دیتی ہیں یہ تیز آوازیں۔ اُتار لے انہیں۔"

نورے نے مہار کو زمین پر پھینک کر میری طرف دیکھا اور پھر بڑھ کر گھنگھرو کھول دئے' زمین پر سے چیتھڑا اُٹھا کر گھنٹی میں ٹھونس دیا اور مہار سنبھالتے ہوئے۔

بولا "سلیم میاں سچی بات کہوں۔ گھنگھرو اور گھنٹی کے بنا اونٹ کی سواری اونٹ کی سواری نہیں رہتی۔ اس سے تو بھینسے کی سواری بھلی۔"

میں نے کہا "اونٹ ہو کہ بھینسا۔ مطلب آدھی رات کو اسٹیشن پر پہنچنے سے ہے' یہ ٹنا ٹن میرا دماغ چاٹ لے گی' اب چلو۔"

"ہاں۔ ہاں بھئی چلو" ہادو بولا۔ "آج چودھویں تاریخ ہے' چاند گھڑی مار کر اُبھرے گا۔ چاند کی راہ نہ دیکھو۔"

"ہاں بھئی چاند کی راہ نہ دیکھو" میں نے کہا۔ "ہم سرکاری ذخیرے کے پاس پہونچیں گے تو شاید تبھی اُبھرے گا چاند۔"

مگر نکڑ پر کھڑا ہوا ایک گبرو بولا "وہ ابھر تو رہا ہے طباق سا۔"

"فی امان اللہ" کواڑ کے پیچھے سے آواز آئی۔

"خیر سے جاؤ' خیر سے آؤ" ہادو بولا۔

"السلام علیکم" ہجوم پکارا۔

"بسم اللہ" نور ابڑبڑایا۔
اور اونٹ گلی سے نکل کر چراگاہ میں پہونچ گیا۔
چاند ہمارے بالکل سامنے تھا۔ گول موٹ اور تندرست، جیسے ابھی ابھی کسی نورانی جھیل میں ڈبکی لگا کر اچھلا ہو۔ چراگاہ کا سبزہ سیاہی مائل نظر آتا تھا۔ اور اس سیاہی میں سبک پگڈنڈی، گھنے بالوں میں باریک مانگ کی طرح چمک رہی تھی۔ سارے ماحول پر پرندوں نے ہجوم کر رکھا تھا۔ ساربان ڈلدار گڈے کی طرح مہار سنبھالے چلا جا رہا تھا اور لاڈلی ہے۔۔۔۔

میں کجاوے میں ذرا آگے سرک گیا۔ اور گردن بڑھا کر لاڈلی کی طرف دیکھا اُس کی کالی چادر ماتھے سے بھی اُوپر سرک گئی تھی۔ اس کے چہرے کی چاندنی نے چاند کی چاندنی میں گھل مل کر ایک عجیب سا نورانی جالا تن رکھا تھا جسکو ایک طرف ہٹانے کیلئے میری نظروں کو کافی مشقت کرنا پڑی۔
مَیں نے کہا "ایں ۔۔۔ تم نے نیچے کوئی چادر دوا ر بھی بچھا رکھی ہے لاڈلی؟
اُس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ کالے بالوں کی مانگ اور سیاہ سبزے کی پگڈنڈی دونوں نے گھل مل کر میرے ذہن پر عجیب سی آڑھی سیدھی لکیروں کا انبار لگا دیا۔ لاڈلی کچھ دیر خاموش رہی جیسے بولنے کی کوشش کر رہی ہے مگر زبان کو مناسب الفاظ سہارا نہیں دیتے
میں پھر جھجکا۔" میں نے کہا لاڈلی۔ کیا کوئی چادر ۔۔۔"
ہچکچاتی ہوئی آواز میں بولی۔" چادر تو نہیں جی ۔۔۔ پر ویسے بھی آرام سے بیٹھی ہوں جی"

میں نے اپنے چار طرف ٹھسے ہوئے گدوں میں سے ایک گدا نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔ "بھئی واہ۔ یہ بھی کیا بات ہوئی۔ یہ گدا لے لو تم۔ اتنا لمبا سفر

ہے اور پھر رات کا وقت ہے اتنے موٹے بان سے کجاوا بنا ہے لورے نے نیند کیسے آئے گی ننھے کو۔ اور تمہیں؟"

اُس نے گد لے لیا اور ساتھ ہی بولی "ننھا تو سو رہا ہے جی اور مجھے سفر میں نیند نہیں آتی"۔

"مجھے بھی نہیں آتی۔"

—— اور اچانک بلندیوں بھری فضاؤں میں ٹنٹناہٹوں کے کوندے لپک گئے لورا ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اور ساتھ ہی اونٹ بھی رک گیا۔ "چیتھڑا گر گیا گھنٹی میں سے"۔ وہ مہار کو زمین پر پھینک کر بولا۔

مجھے دو۔ میں نے کہا۔

"جی؟" لورے نے چیتھڑا اٹھا کر پوچھا۔

"میں کہتا ہوں مجھے دو"۔

"چیتھڑا تو مل گیا مجھے"۔

"میں کہہ رہا ہوں پھینک دو چیتھڑا۔ بجنے دو گھنٹی کو"۔

"یعنی —— ایں —— اچھا"۔ اور چیتھڑا پھینک کر جب اُس نے مہار سنبھالی تو پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میں سمجھا میرے سر میں سینگ اُگ آئے ہیں

"میں بھی حیران تھی آپ نے گھنٹی کیوں بند کر دی چلتے وقت"۔ وہ شاید بچے کو گود سے اتار کر گدے پر لٹا رہی تھی۔

میں اس بات کا جواب نہ دے سکا اُس کی حیرت بجا تھی لیکن ذہن کے سمندر میں بھی مدوجزر ہوتا ہے اور مدوجزر چاند کی کشش کا نتیجہ ہے۔ اور چاند —— لیکن اب تو چاند کے چہرے پر پرچھائیاں سی پڑ رہی تھیں۔ اور

ذہن کے سمندر کا مدوجزر اپنے عروج پر تھا۔ تو پھر یہ کسی اور چاند کی کشش
ہے اس نئے چاند کی چاندنی پر گھنٹی کی ٹنٹناہٹ تیر کے نہیں لگاتی اسکی
جادو اثری میں اضافہ کرتی ہے۔ گھنٹی کی آواز ایک گیت ہے۔ اچھوتا اور مسلسل
جو فطرت کے لبوں سے نکل رہا ہے اپنے دہمی بچوں کا جی بہلانے کی خاطر
اس گیت میں میرے لئے ایک پیغام تھا۔ ایک دعوت تھی ——— میں اُس
کے مترنم الفاظ کو سمیٹ کر من مانی ترتیب دینے لگا۔ گھنٹی کہہ رہی تھی۔
—— رات کا وقت ہے، چاند چمک رہا ہے، ستارے لجا رہے ہیں، ہواؤں
میں انگڑائیاں ہیں، فضاؤں میں نیندیں گھل رہی ہیں، سفر لمبا ہے ساربان
بوڑھا ہے اور بڑھاپا اپنے گردوپیش سے بیگانہ رہتا ہے سبک پگڈنڈی
دور چاندنی کی کہر میں ڈوبتی نظر آتی ہے، کجاوے ڈول رہے ہیں۔ لاڈلی
کا بچہ سو رہا ہے اور لاڈلی جاگ رہی ہے، کیونکہ اُسے سفر میں نیند نہیں آتی،
مجھے بھی سفر میں نیند نہیں آتی۔ دو جاگنے والے آپس میں باتیں نہ کریں تو
یہ سمجھو، اُن کے دلوں میں چور ہے، سفر باتوں سے کٹتا ہے اور باتوں کی حد
بندی نہیں ہو سکتی۔ ذرہ، تنکا اور پھول، جنگل میدان اور پہاڑ، ندی دریا
اور سمندر، ہوا، فضا، اور خلاء ستارے چاند اور آسمان اور آسمان سے پرے
کی دنیا اور اُس دنیا سے پرے ایک اور دنیا ——— سب کے متعلق باتیں
ہو سکتی ہیں اور ان کے علاوہ ——— ان کے علاوہ ———"
گھنٹی نے یہاں تک پہنچ کر علاوہ علاوہ کی رٹ لگا دی، اور میں سوچنے
لگا کہ ان کے علاوہ بھی تو بے شمار موضوعات ہیں: مثلاً یہ اونٹ، یہ کجاوہ،
اور پھر یہ لاڈلی جس کا خاوند دو برس سے جیل میں ہے جس کا بچہ سو رہا
ہے اور جس کے چہرے کی چاندنی چاند کی چاندنی میں گھل مل کر ایک عجیب سا

نورانی جالا بُن رہی ہے۔

اگر مسافر اور منزل کے درمیان اونٹ کا کوہان حائل نہ ہوتا تو شاید گفتگو کو علاوہ علاوہ کی رٹ نہ لگانی پڑتی۔ اس لئے میں دیر تک سوچتا رہا۔ کبھی کبھی ایسا معلوم پڑتا تھا۔ جیسے پرلے کجاوے میں آگ جل رہی ہے اور میں اُس کی آگ میں جھلا جا رہا ہوں کبھی کبھی پرلے کجاوے میں برف کے ایک تودے کا گمان ہوتا جس کی یخ بستگی میرے خیالوں کو جکڑ لیتی اور میں بے دم ہو کر ٹھٹھر کر رہ جاتا۔ مصیبت یہ تھی کہ ستاروں اور چاند کے علاوہ بات کرنے کا کوئی اور موضوع ہی نہیں سوجھتا تھا اور اونٹ کا کوہان حائل نہ ہوتا سبک، پگڈنڈی کو لمبے قدموں سے لپیٹتا جا رہا تھا۔ سرکاری ذخیرہ قریب آچکا تھا اور رات بڑی تیزی سے صبح کے آغاز کی طرف لپکی جا رہی تھی، فطرت فرصت تو دیتی ہے مگر ان فرصت کے لمحوں کو طول نہیں دیتی، انسان ان لمحوں سے اس مختصر سے وقفے میں سب کچھ اخذ کر لینا چاہتا ہے، اس لئے جلد باز ہے اور میں بھی جلد بازی کا مرتکب ہوا میں نے ہولے سے کہا "لاڈلی۔ یہ تمہارا نام بھی خوب ہے"۔

بولی "جی یہ نام تو مجھے چچا نے دیا ہے پیار سے۔ اصل میں تو میرا نام جنوں ہے جنوں کا ۔۔۔ یعنی چاند کی بیٹی! میں نے سوچا اور پھر کہا "جنوں ۔۔۔ یعنی چاند ۔۔۔ یا چاند کی لاڈلی" ۔۔۔ میں نے جلد بازی کی تھی، اور مجھے شعلے کے بھڑک اٹھنے کا ڈر تھا۔ مگر جنوں بولی "جو کچھ سمجھ لیجئے جی پر میرا نام ہے جنوں"۔

میں نے کہا "جنوں، تم اپنے شوہر کے بغیر بہت اداس رہتی ہو گی، دو برس سے وہ تم سے جدا ہے اور ابھی تین برس باقی ہیں"۔

وہ خاموش رہی، اور جھک کر جیسے بچے کو تھپکنے لگی۔ اونٹ بڑبڑایا!

اندر ٹی ھیلی مہار سے فائدہ اٹھا کر چلتے چلتے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہے "میں سب سمجھتا ہوں بچہ جی!" اس کی اس حرکت سے گھنٹی کی آواز میں بھی ہچکولے سے پیدا ہوئے اور نورے نے پلٹ کر مہار کو کھینچتے ہوئے کہا "اب ذ چل بھی ابھی دو کوس چلا ہے اور بڑبڑانے لگا ہے ——— لاڈلا!"

جنوں کھلکنے لگی۔ میں زور زور سے ہنسنے لگا۔ اور رسلدار گڈ قہقہہ لگا کر بولا "نسیم میاں۔ اتنے بڑے جانور کو لاڈلا کہنا ہے تو بڑی عجیب سی بات پر یہ اللہ جیتا رکھے اسے ——— ہے بڑا لاڈلا۔"

اور میں نے جنوں سے کہا "شکر ہے میں نے اس سے پہلے ہی تمہارا نام پوچھ لیا تھا" ——— وہ اسی طرح کنکھے جا رہی تھی کچھ دیر بعد بولی "نورے کا اونٹ لاڈلا ہے چاچا کی میں لاڈلی ہوں۔ میرا ننھا لاڈلا ہے، لاڈ پیار ہی سے تو دنیا چل رہی ہے!"

میں نے اس کی تائید کی "ہاں جنوں لاڈ پیار ہی تو جینا ہے!"

اپنی ذرا سی بات نے بہت سے عقدے حل کر دیئے۔ گھنٹی بھی علاوہ علاوہ کے ٹیلے پھاند گئی تھی اور جب ہم سرکاری ذخیرے میں داخل ہوئے تو میرے ذہن میں ایسی بے ربط مگر مسلسل آوازیں پیدا ہونے لگیں، جیسے سانپ کو دیکھ کر چڑیوں کے غول دیواروں سے چمٹ چمٹ کر چیختے ہیں اب پھر مجھے موضوع کی تلاش تھی کہ اچانک ایک درخت کی ٹہنی میرے کجاوے کے ساتھ پھر زور سے رگڑ کھا گئی۔ اور نورا پکارا "خبردار۔"

"بڑا گھنا ذخیرہ ہے!" میں نے نورے اور جنوں دونوں کو مخاطب کیا تھا مگر جواب جنوں ہی نے دیا۔ "کسی کو ایک ٹہنی تک نہیں کاٹنے دیتا سپاہی جب یہاں کوئی شخص قدم تک نہیں دھر سکتا تو آپ سے آپ گھنا ہو گا ذخیرہ۔"

میں نے کہا "ہاں کانٹ چھانٹ ہوتی رہے تو کجاووں کا رستہ بنا رہتا ہے"
وہ بولی "اس کی کون پروا کرتا ہے جی!"

ناگاہ میں کجاوے میں جیسے اچھل پڑا۔ یہ گھنا جنگل۔ اور یہ کانٹ چھانٹ اور یہ بے پرواہی اور ۔۔۔ گھنٹی کی ٹنٹناہٹ نے کہا "تیرا خیال درست ہے ۔۔۔ درست ہے ۔۔۔ درست ہے!"

اور میں نے لمحاتِ فرصت کے اختصار سے ڈر کر پھر جلد بازی سے کام لیا۔ اور کوہان کے اِدھر سے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ "لاڈلی ۔۔۔ یعنی جنتو!"

وہ میرے گول مٹول بازو اور چھیلی چھیلی انگلیوں کو دیکھ کر کچھ خاموش رہی۔ میں نے [illegible] نشانے پر تیر مارا۔ "ننھا مجھے دے دو۔ اب کچھ دیر تک یہ میرے پاس رہے گا۔ تم پاؤں پسار لو۔ سو جاؤ۔ سفر لمبا ہے۔"

بولی "مجھے تو سفر میں نیند نہیں آتی۔ میں آرام سے بیٹھی ہوں۔ ننھا سو رہا ہے مزے سے۔ رہنے دیجیے۔"

میں نے ہاتھ کو کچھ اور بڑھا کر کہا "نہیں نہیں۔ مجھے دے دو ننھا"
اُس نے اپنے ہاتھ سے میرے ہاتھ کو روکتے ہوئے کہا "رہنے دیجیے آپ کو تکلیف ہوگی۔"

ننھا تو [illegible] مزے سے سو رہا۔ مگر مجھے ننھے کی جگہ جنتو کا ہاتھ مل گیا۔ میں نے کنول کے پھولوں کو بھی چھوا ہے اور نرگس کے ڈنٹھلوں کو بھی۔ مگر اُس کی ہتھیلی کنول سے [illegible] زیادہ نرم [illegible] اُس کی انگلیاں نرگس کے ڈنٹھلوں سے زیادہ [illegible] اور جیسے اُس ہاتھ کی ساری [illegible] میں اس اندر [illegible] کی آواز تک سُن سکتا تھا جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتے کا طواف کرتے [illegible] اور بھنبھناتی [illegible]

ہاتھ میرے ہاتھ میں یا میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں رہا۔ اور ہم دونوں خاموش رہے۔ اور گھنٹی بجتی رہی، اور اونٹ چلتا رہا اور رہگذر گذرا جیسے مثنوی زیر و بم ہاشکار ہو گیا تھا۔ اور کبھی کبھی کوئی نرم ڈال پھر سے کجاوے کو سہلا کر ہمارے پیچھے ڈوبتی جاتی تھی۔

اچانک ننھا رونے لگا۔ میں نے کہا۔ "آنکھ کھل گئی ننھے کی؟" ——— اور میں نے اپنا ہاتھ کھینچا۔

"سو جائیگا" وہ بولی۔ اور میری انگلیوں کو جکڑ لیا۔

لیکن ننھا اب چیخنے لگا تھا۔ میں اپنی انگلیوں کو کھینچ تان کر بولا۔ "ننھے کو سلا دو چینوں!"

اُس نے بے دلی سے میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ "بچے روتے ہی رہتے ہیں سو جائیگا۔"

بازو بہت دیر تک تنے رہنے سے دُکھنے لگا تھا اور اب اسے سہلانے کی اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ اسے پھر سے تان لیا جائے۔ دل و دماغ میں خیالوں اور وسوسوں کی عجیب بے ہنگم اچھل کود جا رہی تھی، میرا ہاتھ دیر تک اسی طرح پڑا رہا۔ اور ذہنی جمناسٹک تیز ہونے لگی۔ اب بات کا موضوع تلاش کرنے کی مشکل در پیش تھی کہ اچانک اونٹ نے گردن موڑ کر ایک درخت کی بہت سی شاخوں کو اپنے جبڑے میں لپیٹ لیا۔ نور نے چونک کر مہار کو کھینچا اور بڑبڑایا۔ "اپنے گھر سے بھوکا چلا تھا کیا؟ ٹھونس ٹھانس کر تو اُٹھا تھا سفر کے لئے لاڈلا!"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لاڈلی سنا؟"

اور جیسے معاً اُس نے میرا ہاتھ دیکھ لیا اپنے ہاتھ سے اسے چھو کر بولی

"جی سنا۔ میرا نام چننوں ہے"

"اور لاڈلے نے کہا نام اونٹ ہے" میں نے کہا "لاڈلا تو اسے صرف نورا ہی کہتا ہے پیار سے"!

—— وہ ہنسنے لگی۔ چادر اس کے سر سے ڈھلک گئی۔ اور میرے دل در بار میں خیالوں کے ہجوم کی اچھل کود رک گئی۔ مگر سرسریاں سی رینگنے لگیں معمول سے بھی زیادہ سست رفتار سے۔ ہمارے ہاتھ بھینچ گئے، اور پھر ننھا رونے لگا۔

اونٹ ڈیرے سے نکل چکا تھا اور اب اونچے نیچے رستے پر سنگریزے اونٹ کے پاؤں سے ٹکرا کر ادھر ادھر لڑھکنے لگے تھے، ہوا تیز ہو رہی تھی اور چاند کے آس پاس میلا سا دھندلکا پھیل رہا تھا۔ میں نے ایک بار چننوں کی طرف دیکھا تو تیز ہوا میں اس کے بالوں کی چند لٹیں اس کے چہرے پر بکھر کر تڑپ رہی تھیں اور پھر جب چاند کی طرف دیکھا تو اس پر مٹمیلے بادلوں کی لہریں سی چھا رہی تھیں

"خدا خیر کرے۔" میں نے کہا۔ "چاند میلا ہو رہا ہے۔"

چننوں بولی۔ "کہیں بارش نہ آ لے"!

میں نے بلند آواز سے نورے کو مخاطب کیا۔ "چاچا ہوا بڑی شروع ہو رہی ہے۔"

وہ پلٹے بغیر بولا۔ "میں بھی ڈر رہا ہوں سلیم میاں۔ بھادوں کے بادلوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ ابھی اٹھتے ہیں۔ ابھی برس جاتے ہیں۔"

چننوں اور میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے! اور پھر چننوں مسکرا دی بھادوں کے بادلوں میں لپکتے ہوئے کوندے کی طرح!

نورے نے اونٹ کی رفتار بہت تیز کرلی۔ کجاوے اب ڈول رہے
تھے اب ہچکولے کھانے لگے فضا جاگ اٹھا، چولیں چرچرانے لگیں۔ اونٹ
کے کوہان پر بستر کی رسّی ڈھیلی ہوگئی اور بستر جھولنے لگا۔ چاندنی رات مدھم
پڑی اور پھر مرگئی۔ اور میں نئی بات کا موضوع تلاش کرنے لگا۔ مگر اب جو بات
شروع ہوتی تھی، وہ فوراً ختم ہوجاتی تھی کیونکہ ہر ندی سمندر کا رُخ کرلیتی
تھی اور سمندر گہرا تھا اور میں اچھا تیراک نہ تھا۔ غوطہ کھانے کے خوف سے
جلد ہی پلٹ آتا۔ اور پھر ایک نئی ندی مجھے اپنی لہروں پر بہاتی سمندر میں
جاگرتی۔ مگر ساحل سے چند مرمریں سیپیاں چن کر میں کھلنڈرے بچے کی طرح
پھر نقطۂ آغاز کی طرف لوٹ آتا۔

اب ہم اسٹیشن سے ایک میل دور تھے۔ ہوا کی تیزی نے شدت
اختیار کرلی، بادل نج اٹھے۔ بجلی کی چمک سے اسٹیشن کی عمارت جیسے دور
اُبھر کر اندھیرے میں کھوگئی لیکن اب چاندنی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے کا امتیاز
مٹ چکا تھا۔ کبھی کبھی کوئی آوارہ بوند بھی آگرتی تھی۔ اور ننھا کھل کھلا کر ہنس
پڑتا تھا اور جب تیز ہوائیں جنوں کی چادر پھڑپھڑاتی تو وہ ڈر کے مارے
بسورنے لگتا اونٹ کی رفتار حیرت ناک ہوگئی تھی، اور نورا بڑبڑا رہا تھا
—"کیا گرجتا گونجتا اٹھا ہے بادل۔ اللہ کرے جمال پورٹر گھر پر ہی ہو،
اس کے کوارٹر میں بیٹھے رہیں گے۔ ابھی تو بہت رات باقی ہے۔"

جمال پورٹر ہمارے گاؤں کا ایک غریب بوڑھا تھا جو مدت سے اسٹیشن
پر کام کرتا تھا اس کا کوارٹر وقت پڑنے ہمارے علاقے کے مسافروں کی
پناہ گاہ بن جاتا تھا۔ جب ہم اسٹیشن کے قریب پہونچ کر جمال کے کوارٹر کے
سامنے رکے، تو گنجان بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ اور بادل دہاڑ رہا تھا۔ نورا

چلایا۔ "اے بھئی جمال پورہ!"

بہت دور سے جواب آیا۔ "کون ہے بھئی" ـــــ اور پھر ایک اندھی اسی بتی نے آنکھ ماری، اور آواز آئی۔ "آیا" ـــــ جمال دوڑتا ہوا آنکلا۔ ہمارے قریب آکر اس نے بتی اوپر اٹھائی، نورے کو پہچان کر اس سے مصافحہ کیا اور جب میرا نام سُنا تو بولا۔ "ارے بھئی اونٹ کو بٹھا کبھی۔ اوپر بھیگ رہے ہیں سلیم میاں۔ السلام علیکم سلیم میاں۔ جیتے رہو بیٹا ـــــ نہیں تو پردیسی ہو جانے پر بھی نہیں ـــ گھر کا نمک نہیں بھولا۔ ارے نورے بٹھاؤ بھی اونٹ کو" اور اس نے خود ہی مہار کھینچ کر ہش ہش کی گردان کر دی۔

"تمہارا حکم نہیں مانے گا۔" نورا بولا۔ "ادھر لا مہار۔ بڑا لاڈلا ہے یہ" ـــــ اور جینوں اور میں ہنس پڑے، صعود سے قعود کی منزلیں طے کر کے لاڈلا بیٹھ گیا میں جلدی سے کجاوے سے اترا۔ جمال سے ہاتھ ملایا اور اسے اس طرف کے کجاوا تھامنے کو کہا پرلی طرف جا کر میں نے ننھے کو سنبھالا اور پھر جب جینوں اتر چکی تو جمال بولا۔ "اندر چلو۔ پھٹ پڑا ہے بادل!"

ہم کوارٹر کے ساتھ ہی برآمدے کی صورت بنے ہوئے چھپر تلے آ گئے، نورا سامان اور گدے اٹھا لایا جمال کوارٹر کے اندر سے دو چارپائیاں گھسیٹ لایا۔ اور چھپر تلے بچھا دیں۔ نورے نے پرلی طرف گدے پھیلا دیئے جمال نے خاطر تواضع سے فارغ ہو کر کہا۔ "یہ بہن کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "چچا بادو کی بہو ـــــ"

"اچھا جینوں بیٹی تم" اس نے لاڈلی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "بیچاری دکھوں کی ماری۔ کتنے برس کاٹ لیے اللہ داد نے؟"

"دو" لاڈلی نے بچے کو چارپائی پر لٹاتے ہوئے کہا۔

اور جمال کوارٹر کے دروازے کو بھیڑتے ہوئے بولا " باقی بھی کٹ جائینگے مصیبتوں کا کیا ہے بھادوں کے بادلوں کی طرح آتی بھی ہیں۔ گذر بھی جاتی ہیں، اور اللہ داد جوانمرد ہے، ہنس کھیل کر کاٹ لیگا باقی مدت ـــــ اچھا تو سلیم میاں، میں گاڑی کے وقت تمہیں جگادونگا، پانی وانی کی ضرورت ہو تو اندر پوربی کونے میں پڑا ہے گھڑا۔ کٹورا بھی وہیں کہیں ہوگا۔"

نورا کجاوا اتار کر چھپر تلے لے آیا۔ اونٹ کا گھنٹہ باندھکر مہار ایک پیڑ سے اٹکادی اور بھیگا ہوا جھولا اتار کر دھم سے گدوں پر گر گیا پھوپھی بھی ایک چارپائی پر ہو بیٹھی۔

میں نے کہا " میرا بستر پڑا ہے اندر۔ وہ کھول کے بچھا دیتا ہوں ننھے کیلئے۔"

مگر وہ بولی " سو رہیگا ویسے بھی سو جائیگا بچوں کی نیند کھری کھاٹ کی پروا نہیں کرتی۔ رہنے دیجئے۔"

میں نے کہا " نہیں نہیں جب بستر موجود ہے تو اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ چچا نورے ذرا اندر آنا۔ بستر کھولنا ہے۔"

لیکن چچا نورا تو خراٹے لے رہا تھا بارش بہت زور سے پڑنے لگی تھی اور ننھا مزے سے سو رہا تھا۔ میں نے کہا " خیر میں خود ہی کھولے لیتا ہوں۔" اور میں اندر چلا گیا

وہ بھی اندر بھاگی آئی " آپ خوامخواہ تکلیف کر رہے ہیں اچھا میں کھولے دیتی ہوں بستر۔"

اور جب میں نے بستر کا ایک چھلا اتارا تو دوسرے چھلے کی تلاش میں وہ بستر کو ٹٹولنے لگی۔ اور پھر ہم نے ایک دوسرے کی باہوں کو پکڑ لیا۔ شہد

کی مکھیاں چھتے کے ارد گرد سر سرانے لگیں۔ میرے کانوں کی گونج بادل کی گڑگڑاہٹوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں نے پھر اپنی فطری جلد بازی سے کام لیا۔ کلائیوں کو چھوڑ کر اُس کے شانوں کو پکڑ لیا وہ شاید اسی انتظار میں تھی اپنی باہوں کو اتنی مضبوطی سے میرے ارد گرد لپیٹ لیا کہ میری پسلیاں کڑکڑا اٹھیں۔ اور میں نے اپنے تپتے ہوئے ہونٹوں کو اس کے چہرے کے نہ جانے کس مقام پر پیوست کرتے ہوئے بستر کو ٹھوکر لگا دی۔

اور پھر معًا باہر ننھا بلبلا اُٹھا۔

میں نے جینوں سے الگ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آنکھ کھل گئی ننھے کی۔"

"سو جائے گا۔" وہ جیسے مجھے تسلی دے رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "ننھے کو سُلا دو جینوں۔"

اور اُس نے اپنے ساتھ مجھے بھی گول بستر پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "بچے روتے ہی رہتے ہیں۔ سو جائیگا۔"

لیکن اب تو بچہ جیسے کھاٹ پر قلابازیاں کھا رہا تھا۔ میں نے بھڑک کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ "جینوں۔ نورا جاگ اٹھا یا جاٹ نکلا تو ــــــ"

"تو کیا؟" اُس نے میرے ہاتھ کو کھینچا۔ "تم تو عجیب ڈرپوک ہو سلیم میاں۔ ارے بیٹھو بھی ــــــ"

میں اُس کے ہاتھ کو گھبراہٹ اور غصے سے جھٹکتا باہر آ گیا۔ وہ بھی میرے پیچھے چلی آئی اور بچے کو گھسیٹ کر کھولے پر رکھ لیا نورا اسی طرح خراٹے لے رہا تھا۔ اور بچہ خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن اب جیسے میں اُس کے قریب گیا۔ تو بھڑک کر راکھ ہو جاؤنگا' مجھ پر ایک عجیب سا لرزہ طاری

تھا، میں چھپر سے نکل کر باہر چلا آیا۔ بارش کے تیز چھالے آن کی آن میں میرے کپڑوں سے پار ہو گئے، میرے بال بھیگ کر لٹک آئے اور میری آنکھوں میں چبھنے لگے پلیٹ فارم پر سے تیزی سے گزرتا میں مسافر خانے میں گھس گیا جہاں ایک مدھم سی بتی جل رہی تھی، جمال ایک کونے سے اُٹھ کر میرے پاس آیا اور بولا "ارے سلیم میاں، کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "میں سگریٹ خریدنے آیا ہوں۔"

مسکرا کر بولا "یہاں سگریٹ کہاں میاں حقہ سلگا دوں؟"

اور میں ایک بنچ پر دھب سے بیٹھتے ہوئے بولا "نہیں حقے کی ضرورت نہیں تم کوارٹر سے میرا سامان اٹھا لاؤ۔ وہاں میرا جی نہیں لگتا۔ اور یہ لو دو روپئے یہ نورے کو دیدینا واپسی کے لئے۔"

لیکن جب جمال بڑی سی بوری اوڑھے میرا سامان لے کر آیا، تو دو روپئے میری ہتھیلی پر رکھ دیئے، اور بولا "جنوں نے نہیں لینے دیئے وہ حرامزادی تو عجیب بکواس کر رہی تھی!"

میں نے بھڑک کر پوچھا "کیا کہتی تھی وہ!"

جمال سوٹ کیس پر بستر رکھ کر بولا "اب کیا کہوں سلیم میاں، گلے میں پھندا اَڑ رہا ہے، بکتی تھی حرامزادی "سو جاؤ تم ــــ بڑا جوانمرد لئے پھرتی ہے اپنے اللہ داد کو جب سے آنکھ کھولی ہے، جوتیاں کھاتا پھرتا ہے۔ دشمنوں سے ــــ سو جاؤ سلیم میاں۔"

سائے

غروب آفتاب کے بعد جب پربتوں میں نصف چاند کی زرد روشنی مسکرانے لگی اور دور ایک گھاٹی میں ایک جھرنے کے کنارے بلند کب بے سُری تانیں اڑانے لگے تو وہ ماں باپ کی کھاٹوں کے قریب سے لہنگا تھامتی کھسک کر جھونپڑے کی دہلیز تک آئی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تنگ پگڈنڈی کے اُس موڑ کو دیکھنے لگی جس کے پاس ایک صاف چوڑی چٹان پر اُس کے خواب منڈلا رہے تھے، ایک لمحے کیلئے پگڈنڈی کا موڑ کسی نامعلوم روشنی سے جگمگا اٹھا۔ اور اُس نے دیکھا کہ ایک نوجوان اپنے خوبصورت لمبے بالوں میں ہاتھی دانت کا سفید کنگھا سجائے اُس کی طرف بازو پھیلائے بڑھا آرہا ہے اور پگڈنڈی کے کنکر اِدھر اُدھر گھاٹیوں میں لڑھکتے جارہے ہیں

کہ اُس کے نئے زریں جوتوں پر کھُرچنیں نہ پڑ جائیں اور ستاروں کا ایک جھرمٹ ایک تاباں بادل کی صورت اختیار کر کے اُس کے سر پر سایہ کئے تیرتا آرہا ہے جھونپڑی کی دہلیز پر کھڑے کھڑے اُس نے محسوس کیا کہ وہ کسی آسمانی جھولے میں بیٹھی جھول رہی ہے اور جب جھولا آگے بڑھتا ہے تو آنے والا نوجوان اُس کے اس قدر قریب آجاتا ہے کہ وہ اسکا سفید کنگھا چُرا کر اپنی زلفوں میں چھپا لیتی ہے اور جھولے کے پیچھے ہٹتے ہی دونوں اس زور سے قہقہے لگاتے ہیں کہ ـــــــ اور اچانک اُس نے بے جانے بوجھے ایک بلند قہقہہ لگایا اس کا باپ کھاٹ پر کروٹ بدل کر بولا "اے کیا ہے آستی؟ کیوں ہنسی تو؟" ـــــــ اور پھر اس کی ماں کی آواز "اے ادھر آ، لیٹ جا میرے پہلو۔ کیوں دہلیز سے چمٹی کھڑی ہے بچے" ـــــــ اور پھر لمبی لمبی "ہوں ہوں" کے بعد دونوں طویل جماہیاں لیتے سو گئے

اس نے اپنے نرم نرم قدم جھونپڑی سے باہر رکھے اور بھیڑوں کے باڑے کے پاس جا کر رُک گئی۔ اُس کی بھوری بلی اُس کے ٹخنوں سے اپنا ریشمیں جسم رگڑنے لگی اور بہت دُور کہیں کوئی بوڑھا کتا دو تین بار بھونک کر خاموش ہو گیا۔ بلی کو دھتکار کر وہ ہولے ہولے قدم اٹھانے لگی اور اُسے معادن کے "وہ دن" یاد آ گئے۔ جب اُس نے ایک طوفانی رات میں نازو کو اپنے جھونپڑے میں پناہ دی تھی۔

بادلوں کی گھن گرج میں جب وہ جھونپڑے کے عین درمیان ایک چولھے کے درمیان بیٹھی اپنے باپ کے پاؤں دبا رہی تھی تو دروازے پر تیز اور بھاری دستک ہوئی اور جب اُس نے پوچھا۔ "کون؟" تو ٹھٹھرتی ہوئی آواز آئی "مرد نازو ستارہ گاؤں والا نازو" اُس نے نازو

کا نام پہلے سے سن رکھا تھا کیونکہ جب نیچے وادیوں میں کبڈی کے میلے ہوتے تو آشی اپنی دوسری سہیلیوں کو ہمراہ لے کر ایک بہت اونچی چوٹی پر چٹانوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ جاتی اور نیچے چوڑے اُبھرے ہوئے سینوں اور گٹھے ہوئے جسموں والے نوجوانوں کو بگولوں کی طرح دوڑتے اور پہاڑوں کی طرح ٹکراتے دیکھتی۔ ایک بار نازو نے علاقے کے سب سے بڑے کبڈی کھیلنے والے کو یوں سر سے گھما کر پھینکا کہ وہ ڈھول پیٹنے والوں کے قدموں میں آن گرا اور پھر جو لوگوں نے نازو کو کاندھوں پر اٹھا کر سارے میدان کا چکر لگایا اور رنگیلی پیلی پگڑیاں مسرتوں کی چیخوں کے ساتھ میدان میں اچھل گئیں تو اس کے دل میں نازو سے دلچسپی سی پیدا ہو گئی!

اور پھر سرما کی اداس دوپہروں میں اور ٹھٹھکی ہوئی بے جان چاندنی سے لپٹی ہوئی راتوں میں اُس کے کنوارے جذبات پر منڈلانے والا اچانک اُس کے گھروندے میں آ دھمکے! ایک بار اُچھل ہی تو پڑی۔ بارش کی شدت میں باہر بھیڑیں دردناک انداز میں ممیا رہی تھیں۔ آشی کے ماں باپ اپنے سوکھے ہوئے بازوؤں کے تکیے بنائے نسوار کی چٹکیاں نتھنوں میں چڑھا رہے تھے اور ایک منحوس صورت والی بلی چولھے کے کنارے اپنی دُم کا آخری سرا اپنے اگلے پنجوں میں دبائے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ آشی لپک کر دروازے کے قریب آئی اور زنگ خوردہ زنجیر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسکی رگوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑ گئی! اپنے خیالوں کے دیوتا کو اپنے سامنے پا کر وہ کیسے ضبط کر سکے گی! کیا اُس کا دل یونہی دھڑکتا رہے گا! کیا اُس کی آنکھیں یونہی کھلی رہیں گی! کیا سرسبز وادیوں میں شیر کی طرح دہاڑتا اور بجلی کی طرح جھپٹتا ہوا نازو اس کی اُس [illegible] پر قدم دھرے گا! ـــــ اور پھر اُس نے اپنے بھدے [illegible] کی طرف دیکھا جنہیں [illegible] ہوئے [illegible] آنے والے [illegible]

کے انتظار میں دم سادھے زرد پڑ رہے تھے ۔ بلی اپنی غنودگی بھری آنکھیں نیم وا کیے اپنی مونچھیں تھرتھرا رہی تھی۔ اچانک آشی کو اُس کے باپ کی آواز نے دہلا دیا۔ "ارے کھڑی کیا سوچ رہی ہے؟ دروازہ کھول. بے چارہ باہر کھڑا ٹھٹھر رہا ہوگا!"

اور جب آشی نے ایک کل کی طرح زنجیر کھول ڈالی اور بھوار لدے جھونکوں سے کواڑ پھٹ سے کھل گئے تو دور مشرقی افق پر چمکتی ہوئی بجلی کی چکاچوند میں اُس نے ایک سرو قد سایہ دیکھا جو آگے بڑھا اور آشی کے پہلو سے سمٹ کر نکلتا چوکھٹے پر دیوالوں کی طرح جھک گیا۔ بلی ہمک کر کھاٹ پر ہو بیٹھی اور آشی کے ماں باپ نسوار کی ڈبیہ سنبھالتے اٹھے اور جب کواڑ بند کر کے آشی نازو کے بالمقابل آکر بیٹھ گئی تو اُس نے دیکھا کہ بھیگی ہوئی ملائم ملائم مونچھوں کے نیچے دو نیلے ہونٹ یوں کپکپا رہے تھے جیسے آشی سے پوچھ رہے ہیں "آشی اچھی تو ہو؟"

نازو کچھ دیر کے بعد سیدھا بیٹھ گیا اور بولا۔ "آج بدقسمتی سے شام کو گھاس کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ گھٹا چڑھی آئی تھی لیکن جنگل کے داروغہ کا ڈر تھا دن کو تو وہ اس پربت کا راجہ ہے۔ بھلا ہو تمہارا کہ اس ویرانے کو آباد کیے بیٹھے ہو ورنہ میں تو ٹھٹھر کر مر جاتا!"

اور یوں ہی باتوں باتوں میں بوڑھا بڑھیا سو گئے اور بہت دیر تک نازو اور آشی سر جھکائے بیٹھے رہے۔ زرد زرد انگاروں کی آنچ کی چمک اُن کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ باہر ہوا شور کر رہی تھی اور چیڑ کے پیڑ مسمار ہو رہے تھے۔ بلی بوڑھے کی بغل میں خرخراتی ہوئی اپنے آپ سے کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ اور آشی کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے پچھلے سال بادلوں کے جمگھٹے میں عید کے چاند کی باریک قاش دیکھ کر دھڑکا!

وہ تھوڑی دیر انگاروں کو گھورتی رہی۔ نازو کے ہاتھوں کی طرف دیکھ لیتی جن کی ہتھیلیاں گلابی تھیں اور جن کا الٹا حصہ سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ ہاتھ کیسے کیسے بڑے بڑے چکلے پینوں پر فولادی ہتھوڑے بنکر برسے ہیں اور یہی ہاتھ انگاروں پر جھکے ہوئے کیسے پیارے معلوم ہو رہے ہیں۔ آشی نے سوچا ــــ اور ان کے ناخون لال بیروں کی طرح سانولے چمڑے میں کس نقاش نے جڑے ہیں ــــ اور لاشعوری شعور پر اُس نے اپنے ناخنوں کو دیکھا اور چند لمحے وہ نازو کے اور اپنے ناخنوں کا مقابلہ کرتی رہی اور پھر باہوں کا ــــ شانوں کا ــــ گردن کا۔ اس نے دو چار بار اپنے شانوں اور گردن کو چھوا ــــ اسی حالت میں اس کی نگاہیں نازو کی ٹھوڑی پر پڑیں اور پھر ہونٹوں اور ناک پر سے ہوتی اوپر اٹھ گئیں ــــ باہر جلتی بجلی اور کواڑ کی جھریوں کے پاس دو قمقمے سے جگمگا کر بجھ گئے ــــ نازو اس کی طرف دیکھ رہا تھا! ایک ساتھ دونوں کی آنکھیں جھپکیں اور پھر ایک ساتھ اُٹھیں۔ اور یوں ہی آنکھوں کے جھپکنے جھکنے اٹھنے۔ اور مل جانے کے خاموش شور میں آشی اپنے والدین کی موجودگی کو فراموش کر بیٹھی۔ اور رُندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"آپ کبڈی کے کھلاڑی ہیں!"

"نہیں۔ میں کبڈی کا کھلاڑی ہوں" ــــ نازو نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور پھر اپنے بے معنی جواب سے شرمندہ ہو کر بولا "یعنی ــــ یعنی میں کبڈی کا کھلاڑی ہوں ــــ!"

ــــ اور اچانک ان کی آنکھوں میں مسکراہٹوں کے ستارے ٹمٹمانے لگے اور ایک بار پھر کواڑ کی جھریوں کے پاس دو قمقمے جگمگا کر بجھ گئے!

"آپ اچھے کھلاڑی ہیں!" آشی نے کہا۔

اور نازو بولا "نہیں نہیں تو بہت بڑا کھلاڑی ہوں۔ میں دوڑ نہیں سکتا میرا ایک گھٹنا ٹوٹ گیا ہے اور ایک کہنی نکل گئی ہے ایک پسلی بھی ایک بار ٹوٹ گئی تھی۔ لیکن حکیم کہتے ہیں کہ پسلی کی چٹخ دوسرے لوگ بھی سن لیتے ہیں۔ یہ کوئی اور چیز چٹخی ہوگی ـــــ پھر بھی مجھے اس دن سے درد رہتا ہے بہت!"

"بھلا کیا چیز چٹخی ہوگی۔" آشی جیسے اپنے آپ سے مشورہ کر رہی تھی ـــ "پسلیوں سے پرے انتڑیاں ہیں اور انتڑیاں چٹخا نہیں کرتیں کٹ جایا کرتی ہیں، یا الجھ پڑتی ہیں۔ کہاں سے آئی تھی یہ چٹخ کی آواز!"

"یہاں سے" نازو نے بائیں جانب کی چوتھی اور پانچویں پسلی کے درمیان اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آشی گھبرا کر ایک لکڑی سے بجھتے ہوئے انگارے الٹنے لگی۔ بلی کی خرخر بلند ہو گئی اور کواڑوں کے جوڑوں کے پاس دو قمقمے جگمگا کر بجھ گئے۔ بادل اس زور سے گرجے جیسے سیلاب کی زد میں آیا پہاڑ بہہ نکلے ہیں اور لپکوں بھرا دیا اپنی زرد لو کو نچا کر دھیما ہونے لگا۔ دروازوں پر بوندوں کی دستک بدستور جاری رہی۔

گجر دم جب آشی کے باپ نے کروٹ بدلتے ہوئے اپنی کہنی سے خرخر کرتی بلی کا سر کچل ڈالا تو اس کی چیخوں سے تنگ آکر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اسے گردن سے پکڑ کر پرے پھینکتے ہوئے بولا "جب دیکھو جب ہی میری بغل میں گھسی آرہی ہے۔ کمبخت کسی رات بغل ہی میں بچے جن دے گی!" نازو مسکرایا اور آشی زور زور سے ہنسنے لگی۔ جیسے کانسی کے کٹورے میں یکبارگی دو چار پیسے گر پڑیں!

بڑھیا بھی آنکھیں ملتی اٹھی جیسے کسی نے پرانے چیتھڑوں کی گٹھڑی کھول ڈالی ہے۔ نیم خوابیدہ حالت میں پکاری "ارے آشو! اٹھ صبح ہو گئی۔ میرے

رہے میں نے بچا دیے۔ وہ تمہارے گھر رہا۔" اور پھر تو لحاف کے قریب آشی کا سایہ دیکھ کر بولی "ارے تو تو بھی جاگ رہی ہے!" اور جب اس نے نازو پر نظر ڈالی تو کھانسنے پر پہلو بدلتی کہنے لگی "تو ساری رات جاگتا رہا بچے؟ کیا کروں، بچے ری دو ہی تو کھاٹیں یہاں ہمارے گھر میں آشی میرے پاس ہی پڑ کر رات کاٹ لیتی ہے میاں۔ یہ تو ان کی کہ آج مجھے اچھے اچھے خواب کیوں دکھائی دیے ورنہ بچے جب آشی میرے پاس سوتی ہے نا تو بس ساری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔ یوں پاؤں پھیلاتی ہے اور کروٹیں بدلتی ہے کہ میں نگوڑی کھاٹ کے بازو سے ہی چمٹ کر رہ جاتی ہوں!"

نازو ہنستا ہنستا اٹھا اور سر کے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتے ہوئے بولا "لے ناں میں اب جاتا ہوں۔ خدا تم سب کا بھلا کرے آج رات اگر تم مجھے پناہ نہ دیتے تو میں ٹھنڈ سے اکڑ گیا ہوتا کسی کھوہ میں!"

اور جب نازو چلا گیا تو آشی دیر تک سوچتی رہی کہ اگر نازو واقعی آج رات کہیں کسی اندھیرے کھوہ میں ٹھنڈ سے اکڑ کر مر جاتا تو کیا ہوتا!۔۔۔ کیا ہوتا!۔۔۔ اور وہ اسی سوچ میں غرق اٹھ کر دروازے تک آئی اور بہت دور ایک موٹر پر سفید پٹھان کے پاس صبح صادق کے ملگجے اجالے میں اسے نازو کا سایہ نظر آیا۔۔۔ اچانک اس کی نظروں میں ساری فضا سایوں سے بھر گئی اور اس نے سوچا کہ وہ خود بھی ایک سایہ ہے ایک پرچھائیں کہ جو جہاں چاہتا ہے نکل جاتا ہے جدھر ہوا لے جاتی ہے اُڑ جاتی ہے۔ چاہے زمین کے کنارے پر جا کر بیٹھ رہے، چاہے نیچے میدانوں میں آوارہ گاؤں کے قریب منڈلاتی پھرے یا جسم کے آرے پر جا کر سو رہے۔۔۔ یا موٹر کے قریب نازو کے سایہ میں گھل مل جائے۔۔۔ بلکہ اس کی ٹانگوں سے نکل کر تیتر کی طرح ایک چڑیا کے

پیچھے بھاگی اور آشی نے اپنا سینہ ٹٹول کر سوچا کہ جیتے جی سایہ بن جانا تو بھوت
پریت کا کام ہے ـــــ میں تو آشی ہوں ـــــ اور وہ نازو تھا اور نازو
سایہ نہیں، جیتا جاگتا جوان ہے کبڈی کا کھلاڑی ہے - اور میں آشی ہوں ان
پہاڑوں کی چرواہی ـــــ لیکن اس سوچ بچار کے باوجود اُسے سایوں کے
خیال سے اُنس سا ہو گیا۔ اور اس روز وہ صنوبروں کے سایوں اور پہاڑوں
کے سایوں اور بھیڑوں کے سایوں کو بہت دیر تک دیکھتی رہی اور جب
اُس نے اپنا سایہ دیکھا تو اس کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ اس کا سایہ
اچانک وہاں سے اُتر پڑے اور دور موڑ کے پاس چوڑی سفید چٹان کے
قریب سے ہوتا ـــــ ! آشی کا دل دریا کی مچھلی کی طرح ایک بار اچھل کر کسی
نامعلوم گہرائی میں ڈوب گیا سامنے سے نازو اپنے کاندھے پر کدال رکھے
جھومتا جھامتا آ رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا سایہ بھی!

جب وہ آشی کے قریب سے گزرا تو کدال کو ایک پتھر پر ٹکا کر بولا! "
بھیڑیں چرا رہی ہو آشی؟"

"نہیں میں بھیڑیں چرا رہی ہوں" ـــــ اُس نے مسکرانے کی کوشش
کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر اپنے کہے پر لجا کر بولی "یعنی ـــــ یعنی میں ـــــ میں
بھیڑیں چرا رہی ہوں!"

نازو اور آشی کے دبے دبے قہقہے چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے چراگاہ میں
گھوم کر کہیں کھو گئے۔ اور وہاں ایک بھیڑ اپنی گردن اٹھا کر اور زبان باہر نکال کر
ممیائی "ما" اور ایک صنوبر کی چوٹی پر سے ایک مور پھڑپھڑاتا اڑا اور چراگاہ
پر سے اڑتا ہوا موڑ کے پاس چوڑی سفید چٹان پر بیٹھ کر اپنی دُم کو نچانے لگا
قریب ہی ایک جھاڑی سے ایک مورنی نکلی اور دوڑا ایک بار مور نے سے پر گر

راتوں کی طویل اور مکمل ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا نازو نیچے جھیل کے
کنارے تارہ گاؤں سے لوگ سوتے دیکھتا اور آشی اپنے والدین کو ٹالا کر بار بار
آتی موڑ کے پاس جھاڑی کی اوٹ میں چوڑی سفید چٹان پر گزرتی خاموشیوں اور
شرمائی سرگوشیوں اور پیاسے بوسوں سے لدا پھندا وقت تھم کر انہیں دیکھتا اور
جب صبح کا ستارہ اپنے پر پھڑپھڑانے لگتا اور دھندلے افق پر اجالے جھلملاتے
تو نازو اور آشی جدا ہو جاتے اور سایوں کی طرح چٹانوں سے گھری ہوئی
مہین پگڈنڈیوں پر سے گزرتے ایک دوسرے کی نظروں سے غائب ہو جاتے!
اور جب صنوبر کے لمبے لمبے سائے پہاڑوں پر اور پہاڑوں کے لمبے
لمبے سائے جھیل پر بچھ جاتے تو ان وادیوں کو آنے والے کٹھن لمحے ملاقات
کا انتظار قیامت خیز دھڑکنوں سے لبریز کر دیتا! سورج ڈوبتا تو انہیں اسی
شدت کا انتظار چڑھتا۔ جیسے ان کے وجود کی تپش سے کائنات جلنے لگی ہو!
—— اور آج رات ان ہی کٹھن منزلوں سے گزر کر آشی نے پھر اس چٹان
کا رخ کیا جس کی سنگین سطح پر گزرے ہوئے رنگین لمحوں کی ایک روح سی بچھی
رہتی تھی آشی آج وقت سے پہلے اس چٹان کے پاس پہنچ گئی۔ اور اس پر دیر
تک ہاتھ پھیرتی رہی پیلا چاند دور مغربی پربت کی چوٹی پر ایک اونچے صنوبر
کی آخری پھننگ پر ٹھوڑی رکھے جیسے سونے کی کوشش میں مصروف تھا اور
سارا منظر دھندلے سایوں کا ایک ہجوم معلوم ہوتی تھی اچانک آشی کے
پاؤں کے تلوے دہک اٹھے اور سینہ یوں پھڑکنے لگا جیسے جھیل کی سطح پر
ابھرے ہوئے کنول کی پنکھڑیاں اکا دکا پرندوں سے تھرتھرا اٹھتی ہیں۔ پیارے
قدموں کی چاپ سنائی دی —— لیکن اچانک وہ لپک کر چٹان کے قریب
جھاڑی میں دب گئی اور سہما ہوا ایک پرندہ پھڑپھڑا کر مخالف سمت میں اڑ گیا

جارہی ہے

بجلی کی طرح کوئی احساس اُس کے رگ رگ میں لہرا گیا اور جب نازو بیس بتیس قدم دور نکل گیا تو وہ جھاڑی کی اوٹ سے ہٹ کر بابوجی کے سامنے آگئی "میں آشی ہوں!" وہ بولی "جس کے لیے آپ کا دوست آپ کو یہاں لے آیا آپ اُس کے واپس آنے سے پہلے ہی مجھے اپنا بنا لیجئے میں اس کمبخت سے نفرت کرتی ہوں کبھی ایک کوڑی تک اُس نے میری ہتھیلی پر نہیں رکھی مُوا کنگلا! آپ سوچ کیا رہے ہیں آیئے آیئے! مجھے چوم لیجئے مجھے اپنی گود میں ڈال لیجئے مجھے اپنی باہوں میں جکڑ لیجئے بابوجی آشی آپ کی ہے کیا آپ مجھے لاہور لیجائیں گے!"

اور جب کافی دیر بعد دور سے نازو کا سایہ واپس آتا نظر آیا تو آشی بابوجی سے الگ ہو گئی اور موڑ کے پیچھے چھپ گئی۔

نازو بابوجی کے قریب آیا تو مایوسانہ انداز میں بولا "خدا جانے کدھر گئی کمبخت ڈھونڈنے میں بھی نہیں اِدھر اُدھر بہت تلاش کیا مگر اُسکا سایہ تک نظر نہیں آیا" آشی موڑ کی اوٹ سے نکل کر نازو کے سامنے آگئی چاند بھی صنوبر کی ڈالی کی اوٹ سے نکل آیا۔

نازو دم بخود رہ گیا اور آشی بولی "تم مجھے کہاں ڈھونڈتے پھرے یہی چٹان تو میری دنیا ہے پالتو کتیا آج بھی گزری نہیں ہوتی کہ اپنے مالک سے چھپ کر کہیں نکل جائے میں نے تمہارے دوست کو انتظار کی تکلیف سے بچا لیا میں نے ان کی تسلی کردی ہے اور تم ---- میرے پیارے نازو ---- میں تمہاری تسلی بھی کردوں؟ ---- اور اچانک آشی نے اپنے کپڑے ایک جھٹکے سے پھاڑ کر الگ پھینک دیئے اور چیخ کر بولی "تمہیں میرا جسم چاہیئے! دیکھ لو

میرا جسم یہ میری پنڈلیاں، یہ رانیں، یہ میرے گول لٹے، یہ رخسار، یہ ہونٹ —— لو
دیکھ لو جی بھر کر دیکھ لو کہ پھر تمہیں کسی اور لڑکی کو دیکھنے کی ہوس نہ رہے، لو ——
گھور گھور کر دیکھو اور اپنی آنکھوں کو سینکو کہ آشی بہت بھولی ہے —— پالتو کتیا
کی طرح بھولی اور نادان ——!

"آشی!" نازو پکارا اور قبل اس کے کہ وہ اسے چھو سکتا، آشی اندھیری
گھاٹی میں کود گئی۔ لہراتے ہوئے بالوں اور پھیلی ہوئی باہوں والا ایک سایہ گھاٹی
کی گہرائیوں کی طرف لپکا، دھپ کی آواز کے ساتھ دو چار پتھر نیچے لڑھک کر ایک
خاموش جھرنے میں جا گرے اور جھرنے کی سطح پر سویا ہوا چاند کا سایہ ٹکڑے
ٹکڑے ہو کر بہت دیر تک تڑپتا رہا!

حدِّ فاصل

پڑوسن کو چھیڑنا کسی کے لئے نئی بات نہیں، اور پھر جس پڑوسن کے دانت موتی کے تاروں میں بکھرے ہوئے ہوں۔ اور جس کے لمبے پٹڑے دوپٹے پر ستارے ہی ستارے ٹنکے ہوں، اُسے چھیڑا تو بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے۔
مسعود پڑوسنوں کے معاملے میں بہت محتاط واقع ہوا تھا۔ کیونکہ چند ہفتے قبل اُس کے ایک دوست نے پڑوس کی ایک لڑکی پر رات کے اندھیرے میں اچانک حملہ کر دیا تھا اور جب لڑکی کے چیخنے چلانے پر محلے کا محلہ اکٹھا ہو گیا تھا تو اُس کے دوست نے خوفناک انداز سے اُن کے سامنے گڑگڑا کر معافی مانگی تھی اور کہا تھا: "اب سے وہ میری ماں ہے"
اس قسم کی نازک صورتِ حالات کا پیدا ہو جانا مسعود کے لئے ناقابلِ برداشت

تھا۔ اس لئے جب وہ نئے مکان میں آیا، تو سب سے اول گرد و پیش کا جائزہ لیا اور جب ساتھ کے فلیٹ سے چوڑیوں کا ایک تیز چھناکا سنا، تو مکان کی چھت پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اور پڑوس کو نئے نئے زاویوں سے پرکھنے لگا۔

لیکن گرمیوں کا موسم قریب تھا اور رات کو صرف چھت پر ہی سویا جا سکتا تھا، صحن تنگ تھا اور تاریک، پیپل کے ایک بہت بڑے ٹہنے نے ڈھک کر اس تاریکی میں مسلسل سرسراہٹ بھی گھول رکھی تھی اور پھر گرمیوں میں رات کو پیپل کی چھاؤں تلے سونا تو ایسا ہی ہے، جیسے گنجے سر پر کھمبی لگا کر بجلی کی روشنی کے نیچے کھڑے ہو جانا۔

دبے پاؤں وہ چھت پر گیا۔ پڑوس کی چھت ایک پست سی دیوار کے ذریعے الگ کر دی گئی تھی، اس لئے وہ اطمینان سے ایک مرتبہ چھت کے پرلے سرے تک ہو آیا، جہاں سے بہت نیچے کھلی سڑک کا منظر دلآویز تھا، اور پھر سڑک کے اس پار مسعود کے فلیٹ کے بالکل مقابل ایک بنگلہ جس کے برآمدے میں بہت سی بلوریں پنڈلیاں کرسیوں سے لٹک رہی تھیں، پنڈلیوں سے اوپر کا حصہ ایک تنے اور کھنچے ہوئے بہت لمبے ٹاٹ نے اوجھل کر رکھا تھا وہ اس ٹاٹ کی بیہودگی کی تاویل سوچ رہا تھا کہ جانے کہاں سے قریب ہی سے آواز آئی۔ "بڈھا بیوی نہ لایا تو نکلوا دینگے!"

یہ بالکل الگ بات تھی کہ مالک مکان عرصہ سے تجرد کی زندگی بسر کر رہا تھا لیکن مجرد کرایہ دار کا بال بچوں والے گھر کے پڑوس میں آ بسنا شاید اسے بھی گوارا نہ تھا اور اس نے مسعود کو متنبہ کر دیا تھا۔ "مگر حضرت، یہ شریفوں کا محلہ ہے آپ کے دوست کی سفارش سے مجبور ہوں، ورنہ کنواروں کو مکان دینے سے میں ہمیشہ کتراتا رہا ہوں، ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا برابر کی ایک کنواری

گرمیوں میں رات کو چھت پر وہ اپنے احباب کے ساتھ گپیں اڑائے گا اور پھر
ریڈیو سیٹ اور گراموفون اور وائلن ــــ اور نہ جانے کیا کیا ان سب چیزوں
کے علاوہ وہ ایک شاندار بیوی حاصل کرنے کا فیصلہ بھی کر چکا تھا اور والدین کو مطلع
کر دیا تھا کہ ٹٹول جاری رکھئے میں ادھر کچھ رقم جمع کرتا ہوں، آپ ادھر تو کوئی
فیصلہ کیجئے۔ لڑکی کے متعلق اس نے صرف یہی لکھا تھا کہ کوئی سگھڑ سیانی
سلیقہ شعار لڑکی ہو، بہت پڑھی لکھی نہ ہو کیونکہ ایک بیوی کیلئے اقبال کے فلسفہ
خودی کی بجائے چولہے میں وقت پر تازہ لکڑی ڈالنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔
لیکن یہاں تو چھت کے ساتھ ہی دوسری چھت تھی اور دوسری کے ساتھ
تیسری اور پھر چوتھی واقعی ہالا ــــ اور پھر لیٹ کر جاگنا بس۔ ہر طرف ننھے
ننھے بچوں کی روں رال، بوڑھیوں کی کھانسیاں، برتنوں کی ٹھنا ٹھن! یہاں تو
اونچا قہقہہ لگانا نہیں اور پڑوسنوں کی آبرو پر بنی تھی! مگر آخر وہ اور کہیں جاتا
بھی تو کہاں جنگ کا زمانہ اور پنجاب کا شہر! مکانوں کی اتنی افراط کہاں کہ اچھے
برے کا امتیاز ممکن ہوتا۔ یہ مکان بھی تو اسے قدرت کی ایک ستم ظریفی نے
بخشا تھا۔ اس کے ایک دوست یہاں ایک میڈیکل لائن میں ملازم تھے، بیوی
پیٹ سے تھیں، انہیں ہسپتال میں داخل کرایا۔ دو تین روز ہوٹل سے کھانا کھایا
تو ان کے اپنے پیٹ میں کچھ گڑبڑ شروع ہو گئی اور لینڈ لارڈ کی مہربانی سے مسعود
کی سفارش پر نئے بیوی اور بچے کو ہمراہ لیا، تبادلہ کرا کے بہاولپور
چلے گئے!

بہت دیر کے بعد وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ ساتھ کی چھت پر بالکل خاموشی
تھی اور زرد ہوائی جہاز کہیں دور بھنبھنا رہا تھا۔ پرندے بھی پر نیند ہو گئے تھے۔
مسعود نے بھی تمام بکھرے فکر ایک مرکز پر سمیٹ لیا اور جب پورے اطمینان سے

اٹھا تو اپنے بالکل مقابل اُسے ایک خاتون کا چہرہ نظر آیا۔ جو "اوئی" کر کے پیچھے ہٹی اور
چوڑیاں چھنکاتی سلیپر گھسیٹتی سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔ اور پھر موٹے مسٹنڈے
اور بچے شہدے سے لیکر اُس مقام تک مسعود کی قصیدہ خوانی کی جسے عُرفِ عام
میں ساتویں پشت کہتے ہیں!

معاملہ نئے نئے پڑوس کا تھا۔ ورنہ مسعود کے پاس بھی مسٹنڈے اور شہدے
کے مقابلہ میں گرجتے گونجتے الفاظ کا ایک ذخیرہ جمع تھا۔ جو کنوارے ساتھیوں کی
طویل شبانہ صحبتوں کا ایک عالمگیر تحفہ ہے حدِ فاصل کے آخری سرے پر چار آنکھوں
کی یہ مڈبھیڑ مسعود کے دماغ پر پہلے پہل ایک اچانک حادثہ کی طرح اثر انداز
ہوئی اور کچھ دیر تک ہکا بکا کھڑا بہت پرے کے فلیٹ کی چھت پر ایک
بوڑھے کو دیکھتا رہا جو اینٹوں کے ٹکڑوں سے حدِ فاصل کو بلند کرنے کی کوشش
کر رہا تھا!

مسعود نہایت احتیاط سے سرک کر نیچے آیا، اُس کا ملازم باورچی خانہ
کی سامنے والی دیوار پر ایک فلم ایکٹرس کی تصویر کے اوپر کوئلے سے خوش آمدید
لکھ رہا تھا۔ مسعود نے پہنچتے ہی پوچھا "سلطان۔ ارے بھئی سوئیں گے کہاں؟"
ایکٹرس کی تصویر اور خوش آمدید کی جنت سے اچانک باہر گھسیٹے جانے پر
وہ بوکھلا سا گیا۔ اور نہایت بھدّے انداز میں ہنس کر بولا "لنڈے بازار سے"
"لنڈے بازار سے" اُس کی گھبراہٹ اور بڑھی۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"یہ فوٹو خریدی تھی" وہ پیلے دانتوں کی بھرمار سے مسوڑوں سمیت دکھا
کر بولا۔

مسعود مسکرایا اُس بالٹی کی طرح جس کا سیسہ دھوئیں سے سیاہ ہو
چکا ہو اُس نے کہا "ارے بھئی۔ میں نے تو تصویر کی کوئی بات نہیں کی، میں نے تو پوچھا

رہا تھا کہ آخر ہم رات کو سوئیں گے کہاں؟

بولا۔ ”اوپر“

میں نے کہا ”مگر اوپر تو ——“

”اوپر کیا؟“

”بھئی اوپر اچھی جگہ نہیں“۔

”اچھا جی!“ اس نے تعجب سے کہا ”اور گوری چھت پر بیٹھی نہائے؟“ گاتا اوپر چلا گیا۔

مسعود کمرے میں آکر ایک گرد آلود کرسی پر بیٹھ گیا اور کھڑکی سے مقابل کی کوٹھی کو دیکھنے لگا۔ گوری پنڈلیاں ٹاٹ کے پردے کے نیچے اسی طرح لٹک رہی تھیں اور باہر پلاٹ میں ایک ہندوستانی بیرہ پگڑی پر پٹیل کا ایک بلہ لگائے ایک سفید کتے کو کھلا رہا تھا۔

سلطان دبے پاؤں اس کے قریب آیا اس کی آنکھوں میں حیرت اور لذت کی چمک پیدا ہو رہی تھی۔ سرگوشی میں بولا ”بابوجی۔ سنیے گا؟“

”کیا سنوں؟“ وہ ذرا آگے جھک گیا۔

”برڈوس میں گانا ہو رہا ہے“۔

”گانا ہو رہا ہے؟“ —— اس نے کان لگا کر سنا۔ تو ”گوری چھت پر بیٹھی نہائے“

کی باریک تانیں چند فاصلے سے اچھل اچھل کر اس کے فلیٹ کے صحن میں برس رہی تھیں۔

”کون گا رہا ہے؟“ اس نے پوچھا

”اجی گا رہی ہے کوئی۔ سنیے تو!“ اس نے ایک آنکھ میچ لی آواز آئی:...

گوری چودہ برس کی چھوری
گوری اپریت کرائے جورا جوری
گوری موتی دلوں کے چرائے
گوری چھت پر بیٹھی نہائے

مسعود نے کہا۔ "کون ہے؟"

اُس نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کو ملا کر ہاتھ کو تھرایا اور بولا "سانولا سلونا من بھائے رے۔"

مسعود نے کہا۔ "بکواس بند کرو۔"

اس کے اچانک بگڑنے پر وہ ٹھٹک سا گیا۔ اور ایک دیگچی اٹھا کر نل کے پاس جا بیٹھا۔

آواز مسلسل آتی رہی، سلطان دیگچی کو رگڑتا رہا اور سنہری دانتوں والی پڑوسن کے تصور اور سانولے سلونے کے پر معنی اشارے میں الجھا ہوا تھا۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ غضبناک پڑوسن کا رنگ ضرورت سے زیادہ نکھرا ہوا تھا۔ اور سانولے سلونے کے الفاظ سن کر تو ایک ایسا چہرہ سامنے آجاتا ہے جس پر پھیکی سی اڑی اڑی سی سیاہی چھائی رہتی ہو، آخر سلطان نے کیسے دیکھا تھا۔ اور یہ شریر گیت گانے والی کون ہے جس کی آواز میں نئے ریشم کا الھڑ پن اور تازہ پھولوں کی شگفتگی ہے۔ نئے مکان کے سلسلے میں اسے بہت سے ضروری کام کرنے تھے مگر اس الجھن نے اسے جکڑ سا رکھا تھا۔ گیت ختم ہوا تو اس نے ایک اور رُخ پر سوچنا شروع کیا۔ "اگر پڑوسن میرے سامنے آجانے سے اس درجہ برفروختہ ہوئی ہیں، تو آخر اُن کے غصے کی مدت کچھ طویل ہونی چاہیئے۔"

تھی" انہوں نے یہ کیسے برداشت کر لیا کہ اُن کی کوئی بہن یا لڑکی یا کوئی اور عزیزہ گیت گائے" اور وہ کبھی چھت پر گوری کے نہانے کا گیت —— "بہت کچھ سوچ بچار کے باوجود اس نے محض اپنے ذہنی سکون کے لیے یہی نتیجہ نکالا کہ عورت مکڑی کے جالے کی طرح نازک اور پُراسرار چیز ہے وہ آندھیوں کے تھپیڑوں میں بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتی ہے مگر ایک انگلی کے ذرا سے مس سے اپنی جگہ سے اکھڑ بھی سکتی ہے۔ عورت کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کرنا تارِ عنکبوت کا کیمیاوی تجزیہ کرنا ہے —— اس نے اپنے آپ کو دھندلے اور باریک، ملائم تاروں میں لپٹتے دیکھا۔ تو پکار اٹھا۔ "سلطان"۔

وہ شاید باہر سے بولا۔ "جی حضور"۔

مسعود نے کہا "ادھر آؤ"۔

سلطان قریب آکر بولا۔ "جی فرمائیے"۔

"ناراض ہو گئے؟" اس نے اپنے ہونٹوں پر ایک مطلبی سی مسکراہٹ ابھاری۔ سلطان کی سنجیدگی بلبلے کی طرح ناپید ہو گئی۔ پیلے دانتوں کو بھورے مسوڑوں سمیت دکھا کر بولا۔ "آپ بھی خواہ مخواہ ناراض ہو جاتے ہیں"۔

"بیٹھ جاؤ یہاں"

وہ وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔

"دیگچی دھو لی؟"

"جی دھو کر رکھی تھی پہلے سے میں نے تو بس آپ کے ڈر سے ——"

مسعود ہنسا۔ جیسے لٹھا پھٹتا ہے ایک عجیب سی لذت آمیز مگر تکلیف دہ الجھن کے دوران میں ہنسنا جنازے پر اچھل پڑنا ہے اسکی [illegible] یہ ہنگامہ [illegible]

[illegible] بولا۔ "[illegible] ..."

مسعود نے کہا! "کوئی اور بات کرو"

"اور بات"

"ہاں ہاں۔ سانولے سلونے بھائی کا قصہ سنا دو۔"

"اجی حضور" وہ قہقہہ مار کر ہنسا! "کورا گھڑا کبھی دیکھا ہے آپ نے؟"

"ہاں"

"اُسے کبھی بجایا بھی ہے؟"

"ہاں ہاں"

"تو بس کورا گھڑا سمجھئے اُسے۔ بھری بھری۔ جیسے ابھی چھلکی کہ چھلکی گول مٹول سی، لکھنؤ کی ککڑیوں کی طرح۔"

"اور آواز تو بیشک کورے گھڑے کی سی ہے۔"

"یہ تو حضور دُور کی بات ہے نا۔ پاس سے سنئے تو بات ہی اور ہے۔ ہر تان میں پھڑکی ہے۔"

"ناک نقشہ ـــ"

"وہ تو حضور رنگ کی بپتا پڑ گئی ورنہ یہ آنکھیں اور اتنے اتنے بال، اور منہ ـــ جیسے کسی نے نشتر سے ذرا سا چیر دیا ہے آپ تو جہاں بھی گئے، ویران میں مکان لیا، رات کو آنکھ کھلی تو الو میاں پکار اٹھے، اور دن کو دھوپ اور آندھی اور گرد و غبار ـــ وہ آپ کو یاد ہے نا پور بنا ـــ وہ چھت لیپنے آئی تھی اس روز شام کو میں نے چاول پکا دئے تھے۔ صرف اس لئے کہ اُسے ـــ"

"میں سمجھ گیا، تم تو بہت لمبا قصہ لے بیٹھے، اچھا تو کورے گھڑے کی بات کر رہے تھے تم!"

"جی ۔۔ " وہ بولا۔ "یعنی ایسا لگتا ہے جیسے کمہار نے کبھی نہیں چھوا۔ کہیں اوپر سے فرشتہ اُتار لائے ہیں۔ میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ پڑوس تو چٹپٹا ملا ـــــ آپ کا جی بھی بہلا رہے گا!"

"چل ہٹ" مسعود نے غصے سے کہا۔

مگر وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ اور دھیمے دھیمے گنگناتا ہوا باورچی خانہ کی طرف چل دیا۔ "گوری ـــــ ہائے رے گوری ـ چھت پر بیٹھی نہائے ا ـــ"

لیکن مسعود چھت پر ٹھیک اُس وقت گیا۔ جب سورج غروب کی حد سے بھی کہیں نیچے جا چکا تھا۔ حدِ فاصل کے اُس طرف بچے کے ہنسنے رونے کے سوا کوئی بلند آواز سنائی نہ دی۔ البتہ ایک مرتبہ ایک طویل "ہائے" کی آواز سے وہ چونکا تکیے سے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا۔ کہنی کے بل ہو بیٹھا۔ لیکن جب کچھ پلے نہ پڑا تو سو گیا۔

اسے بڑے مزے کی نیند آئی۔ تمام رات کنوڑے سے بجتے رہے اور گھت سے سر سراتے رہے۔ صبح آنکھ کھلی تو سورج نکل چکا تھا اور نیچے سڑک پر ٹریفک کے شور نے محاذِ جنگ کا سماں باندھ رکھا تھا۔

چند روز اُس نے بہت احتیاط سے کام لیا۔ لیکن جب احتیاط ضرورت سے زیادہ ہو تو بے احتیاطی لازمی ہے۔ سلطان بازار میں سودا لینے گیا تھا اور وہ باہر دالان میں بیٹھا بیلیں کے پتوں کی کروٹیں اور کپکپاہٹیں دیکھ رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اُس نے کہا۔ "دروازہ کھلا ہے۔"

"بی بی جی نے یہ چاول بھیجے ہیں۔" آواز آئی۔

مسعود نے پلٹ کر دیکھا تو ایک سانولی سلونی گول مٹول سی لڑکی ہاتھ میں چاولوں سے بھری ہوئی ایک پلیٹ اٹھائے نظریں جھکائے کھڑی

تھی اچند روز کی ذہنی کوفت نے اس کے دماغ پر جو بوجھ سا ڈال رکھا تھا ہٹ گیا۔ "اچھا اگر یہ ہے وہ پیاری پیاری آواز والی سانولی سلونی چھوری" اس نے سوچا اور پھر پوچھا "کس نے؟ ... بی بی نے؟"

"یہ ساتھ والی ایلسا نا" وہ بولی "انھوں نے کہا ہے یہ چاول بابو جی کو دے آؤ۔"

"اندر رکھ دو، کونے والی میز پر" مسعود نے بے پروائی سے کہا "اور میری طرف سے بی بی جی کا شکریہ ادا کرو۔"

"جی اچھا" وہ اپنے آپ کو دوپٹے میں جکڑتی چلی گئی۔

باہر ایک ہوائی جہاز بڑبڑا رہا تھا۔ موجودہ دور میں نت نئے طیاروں کو دیکھنے کے باوجود ہم ہندوستانیوں کی حیرت میں کمی نہیں آئی۔ ادھر سر پر سے طیارہ گزرا۔

اُدھر بڑے بڑوں کی آنکھیں آسمان پر لگ گئیں۔ "یہ جا رہا ہے۔ وہ جا رہا ہے، وہ مڑ رہا ہے، وہ غوطہ لگا رہا ہے ... گھبرا رہا ہے ... نہیں، بم مار رہا ہے ... نہیں نہیں، دیکھ بھال کرنے والا طیارہ ہے۔ ارے رہنے بھی دے تجھے کیا معلوم اور تجھے سب کچھ معلوم ہے جیسے تمہارا باپ ایر کمانڈر رہ چکا ہے۔ ہاں؟" ہائے ہم جیسوں کی بے ضرر دشمنیاں اور معصوم مخالفتیں۔ جن کی تہ میں اجنبیت کا احساس ہے، اجنبیت کا احساس تعجب اور حیرت کا منبع ہے اور حیرت میں کرید ہے، تلاش ہے، جذبۂ حصول ہے۔

مسعود لپک کر دالان میں آ گیا۔ طیارہ بڑبڑا رہا تھا۔ مگر بیلیں کے گھنے ٹھنڈ نے چھتری سی تان رکھی تھی، سٹ پٹا کر مسعود نے آسمان کے اس حصہ کی طرف دیکھا جو چھت اور بیلیں کے درمیان حائل تھا۔ لیکن وہاں طیارے

کے بجائے اُسے وہی سانولی چھوکری نظر آئی، جو منہ کھولے آسمان کو گھور رہی تھی
تھی۔ مگر وہ ان لڑکوں سے اُسے جھکانے سے اُس کے جسم میں ایک انوکھا احساس پیدا ہو گیا تھا
اجنبیت، حیرت اور کرب کا ــــ مسعود کرسی پر بیٹھ کر ہوائی جہاز کے بہانے
اُسی کو دیکھنے لگا۔ اور وہ بھی ہوائی جہاز کے بجائے آسمان کے کسی اور نقطے پر
نظریں جمائے دیکھ رہی تھی، کیونکہ ہوائی جہاز جا چکا تھا۔ اور چیلوں کے جھپٹنے پر پرندوں نے
چیخم دھاڑ مچا رکھی تھی۔

کچھ دیر کے بعد اُس نے دالان میں جھانکا۔ پیالے لگی، تو مسعود نے کہا "پلیٹ
لے جاؤ بی بی۔"

وہ کچھ جواب دیئے بغیر پرے ہٹ گئی، تو مسعود نے چاولوں کو ایک اور
پلیٹ میں ڈالا۔ اور دالان کے بڑے دروازے سے ملحقہ کواڑ پر ہلکی سی
دستک دے دی۔

"کون ہے" اندر سے آواز آئی۔

"پلیٹ"! اس نے کہا۔

سانولی لڑکی نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا تو پرلی طرف مسعود کو
لڑکی کی دبی دبی سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔

"اتنی بھی کیا جلدی تھی"، سانولی لڑکی جیسے رٹا ہوا فقرہ دہرا رہی ہے۔
مسعود بولا۔ "بال بچوں کا گھر ہے۔ کیا خبر کب ضرورت پڑ جائے دوائی کی"
ــــ اور اپنے فلیٹ میں آ گیا۔

سلطان اسے پرانا ملازم تھا، اِس لئے اُس سے اُنس بھی تھا، لیکن
اس نئے سفر میں اُسے تنہائی کی آرزو تھی۔ بڑے کمرے میں ایک کرسی پر لیٹ
کر وہ بہت دیر تک آنے والے دنوں کے دلآویز نقوش ابھارتا رہا، لیکن

سلطان کا وجود ان نقوش کو پوری شدت اور رعنائی سے ابھرنے نہیں دیتا تھا!
اور آخر جب سلطان [illegible] بازار سے واپس آیا تو مسعود نے کہا "سلطان — کیا حال ہے تمہاری ماں کا؟ پھر [illegible] اپنے گھر رہے؟"

وہ ہاتھ باندھ کر نیاز مندانہ انداز سے بولا "حضور! پہلے تو مہمان کی مشکل تھی اب وہ مشکل دور ہو گئی ہے تو مجھے گھر جانے کی اجازت دے دیجئے، ماں ابھی تک بیمار ہے میں ایک مہینے تک ضرور واپس آجاؤں گا۔ میں خود ہی آج آپ سے عرض کرنے والا تھا۔"

مسعود نے التجا کی منظوری کو منطقی طول دینا چاہا "مگر سلطان مجھے کھانے کی تکلیف ہوگی۔"

وہ اُس کے قریب بیٹھ کر لجاجت سے بولا "ہمارے مکان کے بالکل نیچے اچھا بھلا ہوٹل ہے، اور پھر حضور میں تو ایک مہینے سے بھی پہلے آنے کی کوشش کرونگا۔"

مسعود نے اسے اجازت دیدی، اور وہ سفر کی تیاریوں میں اتنا محو ہوا کہ پڑوس کا گرما گرم موضوع تک نہ چھیڑا، عصر کی گاڑی سے وہ اپنے گاؤں کو روانہ ہو گیا۔

اب میدان صاف تھا لیکن صاف میدان میں راستہ معین نہ ہو، تو بھٹکنا یقینی ہے گہرے سوچ بچار کے بعد مسعود نے یہی فیصلہ کیا کہ کھل کھیلو دنیا فانی ہے، جوانی ہمیشہ نہیں رہتی، اور سلطان کی آمد کا کوئی اعتبار نہیں شام تک وہ کھڑکی کے قریب بیٹھ کر گونجتی ہوئی سڑک کو دیکھتا رہا جس پر سے لوگ، پاگلوں کی طرح گزر رہے تھے۔ موٹروں، تانگوں اور سائیکلوں کے قافلے دندناتے ہوئے آتے اور نکل جاتے۔ موٹے موٹے سیٹھ اپنی بیویوں ما

بیٹیوں کو بنا سنوار کر ایک طرف سے نمودار ہوتے اور ہنستے کھلکھلاتے دوسرے
موڑ پر غائب ہو جاتے، غریب اور بڑے لکڑیوں کے نیچے ہوئے دھاکوں کو نوچتے، پلپلے
آم چوستے اور گندے ہاتھوں کو دھوتیوں سے پونچھتے سڑک کے کنارے کنارے
رینگتے دور نکل جاتے۔ ایک چکر جاری تھا۔ ازلی و ابدی جس کا ٹھہراؤ ممکن نہ تھا
پرلی طرف کوٹھی کے برآمدے میں ٹاٹ کا پردہ اُٹھ چکا تھا لیکن گوری
پنڈلیاں سبھی غائب تھیں۔ سفید پگڑی والا بیرہ اپنی پگڑی اُتار کر پیتل کے بلّے
کو رگڑ رگڑ کر چمکا رہا تھا۔

زندگی پوری تیزی سے رواں دواں تھی، اور مسعود کھڑکی کے پاس بیٹھا
اپنے تپتے اور دکھتے ہوئے دماغ کو دونوں ہاتھوں میں تھامے سوچ رہا تھا
کہ جب ہر چیز میں حرکت ہے۔ زاویئے بدل رہے ہیں، چھاؤں ڈھل رہی ہے
سورج دور شیشم کے درختوں کی اوٹ میں مغرب کے دھواں دھار پھیلاؤ
کی طرف پھسلا جا رہا ہے۔ ٹاٹ اُٹھ چکا ہے، بیرے دن بھر کی مزدوری کے
بعد واپس آ گئے ہیں، ہوٹل والا حقے کو چھوڑ کر شامی کبابوں کی ٹکیاں بنا رہا ہے
تو اُس کا یوں جم کر بیٹھے رہنا یقیناً اس کی بزدلی اور کم حوصلگی کی دلیل ہے۔ وہ
جھڑک کر اُٹھا اور سیڑھیوں پر دھک دھک پاؤں مارتا چھت پر آ گیا۔
ساتھ کے فلیٹ میں ایک بچہ رو رہا تھا۔ اور چھت پر ایک بوڑھا پست
دیوار پر مزید اینٹیں جما رہا تھا۔ وہ چھت پر ٹہلتے ہوئے "گوری چھت پر بیٹھی
نہائے" گنگنانے لگا۔ پیپل کے ٹہنوں پر چڑیوں کے غولوں نے شور مچا رکھا تھا
اس لئے شاید اس کی گنگناہٹ پڑوس کے صحن پر نہ برس سکی۔ گنگناہٹ سے
اگلا درجہ بلبلاہٹ کا ہے لیکن اپنے آپ میں اتنا حوصلہ نہ پا کر وہ نیچے اُتر آیا۔
ابھی کھڑکی کے پاس گیا تھا کہ دالان کا دروازہ ہوا سے کھلا اور سانولی لڑکی

دوپٹے میں کوئی چیز چھپائے اندر آگئی۔

"کہاں رکھوں؟" اُس نے پوچھا

"کیا ہے؟" وہ بولا۔

"حلوا" وہ مسکرائی۔

"کس نے بھیجا ہے؟"

"میں لائی ہوں۔"

"لیکن بھیجا کس نے ہے؟"

اُس نے پلیٹ کو میز پر رکھ دیا اور بولی۔ "آپ کو کھانے سے غرض ہے پوچھ کر کیا کریں گے؟"

"بی بی جی نے مہربانی کی ہو گی۔"

"نہیں" وہ مشین کی طرح بول اٹھی۔ "آپ کھا تو لیجئے۔"

"تو پھر تم لائی ہو!"

وہ خاموش رہی۔ میز پر پڑے ہوئے اخبار کو اٹھا کر ایک بکس پر رکھ دیا اور گردن کو جھکا کر مسکرانے لگی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"نوکرانی کو نام سے کون پکارتا ہے جی" وہ بولی "ویسے میرا نام بلقیس ہے" اور پھر پلٹتے ہوئے کہنے لگی "دیکھئے، بی بی جی کو نہ بتائیے گا۔ پلیٹ میں خود ہی آکر لیجاؤں گی۔"

"کب؟"

"شام کے بعد۔"

"شام کے بعد؟"

اور اندر وہ مسکرا کر باہر چلی گئی۔

اوسط درجے کے گھر کی ایک ادنیٰ سی ملازمہ کی آخر بساط ہی کیا ہوتی ہے لیکن دوسرے ہی دن وہ مسعود کے پاس ایک رومال لے آئی۔ خالص ریشم کا رومال جس کے کناروں پر ترشے چھدا ہوا دل کڑھا تھا۔ لال دھاگے سے، مسعود چوبیس گھنٹے بلقیس کی اس عجیب و غریب توجہ کی تاویلیں کرتا رہا۔ مگر اگلے روز ٹھیک اسی وقت بلقیس آئی اور ایک نہایت پیاری سی ننھی سی گھڑی اس کے ہاتھ پر رکھ کر بولی "یہ آپ کے کام آئیگی میں کیا کرونگی اسے اپنے پاس رکھ کر۔ دنوں سے بیکار پڑی ہے!"

اور پھر تحائف کا ایک طوفان شروع ہوگیا، بلقیس نت نیا تحفہ لے کر آتی، مسعود اُسے ٹالتے، سمجھاتا، ڈرتا، لیکن اُس نے بس ایک ہی رٹ لگائے رکھی "ایک غریب کا تحفہ قبول کرنے میں آپ کو اتنا کچھ سوچنا پڑتا ہے — میری قسمت!"

بار بار یہ خیال مسعود کو پریشان کر دیتا کہ آخر بلقیس اتنی غریب ہو کر تحائف کے یہ انبار کہاں سے لاتی ہے اور کیا سونے کے دانتوں والی فردوس کو اس بات کی خبر نہیں کہ جس مشٹنڈے کے لئے اس نے پہلے روز کی جھڑپ کے فوراً بعد لذیذ چاولوں کی ایک پلیٹ بھجوائی تھی، وہ اب بلقیس کے تحائف سے لدا پھندا چھت پر نہیں چڑھ سکتا۔ بلقیس سانولی سہی، گول مٹول ہی، مگر وہ جوان تھی اور اس کے دانتوں کو سنہری غلافوں کی ضرورت نہیں تھی، وہ دروازے کے قریب مسعود کو پلٹ کر دیکھتی تھی تو کائنات اس کی "اوری" ہیلا چابلاہٹ تھی. کھسیانہ پن نہ تھا وہ مسکراتی تھی تو

ساری دنیا دم سادھ لیتی تھی ایک پھریری سی لے کر سنبھل جاتی تھی، ایک
گیتوں میں نئے نئے پلٹے نمودار ہونے لگے اور ان کا موضوع بھی بدل گیا۔ اب وہ
"پیارین ایک پل میں بلیم" اور "تورے نین میں امرت چھلکے" گاتی تھی، اور کبھی کبھی
مسعود کے دالان کے بند دروازے پر کھٹاک سے انگوٹھی مار کر ہولے ہولے
کہتی تھی۔ "تورے نین پیا تورے نین"!

لیکن بلقیس ایسی غریب لڑکی کی محبت کو صرف حیرت اور تعجب کی
بنا پر فراموش کر دینا مسعود کے لئے ممکن نہ تھا، سوچتے سوچتے آخر وہ اس
نتیجے پر پہونچا کہ اُسے صرف بلقیس سے مطلب ہے، تحائف کی اس بھرمار
کو علم النفسیات کے ماہرین ہی جانیں۔ وہ ان تحائف کو ایک پوٹلی میں
محفوظ رکھتا گیا۔

انہیں دنوں سلطان نے گاؤں سے اُسے خط لکھا کہ اسکی ماں کی علالت
خطرناک صورت اختیار کر چلی ہے اس لئے مزید ایک ماہ کی چھٹی کی ضرورت ہے
مسعود نے اُسے فوراً جواب لکھا کہ "جب ماں ایسی مقدس و محترم ہستی
کی زندگی کا معاملہ ہے، تو ایک ماہ چھوڑ آٹھ دس ماہ گزار لو۔ میں ان آقاؤں
میں سے نہیں ہوں، جو ملازم کے دل کو پتھر کا ٹکڑا سمجھ کر اُس کے احساسات
کی پرواہی نہیں کرتے۔"

سلطان سے یوں مستقل طور پر چھٹکارا حاصل کر کے مسعود نے زندگی
کے اس تسلسل کو توڑنا چاہا۔ جس میں سوائے تحفوں، مسکراہٹوں اور
کنکھیوں کے اور کچھ نہ تھا ایک رات جب آسمان کی سیاہی بے شمار ستاروں
کی وجہ سے اور گہری ہو گئی تھی، اور ہلکی ہوا سے بڑے کمرے میں لٹکا ہوا کیلنڈر
جھوم رہا تھا وہ دالان میں جا کر پُر معنی انداز میں کھنکارا، اور اسکی مسرت

اور حیرت کی کوئی حد نہ رہی، جب کچھ دیر کے بعد دالان کا دروازہ ہولے سے کھلا، بلقیس اندر آئی۔ اور آہستہ سے بولی "جی فرمائیے۔"

یہ مسعود کی زندگی کا شگفتہ ترین دن تھا۔ پہلی مرتبہ اُس نے سُننے سنانے کے انداز میں اظہار محبت کیا، پہلی مرتبہ اس نے بلقیس کے سانولے رنگ کی تعریف کی اور کہا "یہ ہے اصلی ہندوستانی رنگ۔ میں تو اسے قومی رنگ کہنے لگا۔ اسی لئے تو میں چاکلیٹ پسند کرتا ہوں"۔۔۔ اُس نے بلقیس کے گندھے ہوئے بالوں کو داغ کے ایک شعر کی مدد سے "دام صیاد" کا نام دیا، اور پھر زبان کے بے حد و حساب معجزے دکھانے کے بعد بولا۔

"یہ اتنے تحفے تم کہاں سے لاتی ہو بلقیس؟"

بلقیس سٹ پٹا گئی "آپ تو بس یہی سوال کرتے ہیں مجھ سے، آپ مجھ کمبخت کی محبت کو دیکھتے نہیں، تحفوں کی بات ہی سوچتے رہتے ہیں آسمان سے آتے ہیں یہ تحفے۔۔۔ بس۔ اب ہوئی تسلی آپ کی؟"

"بڑا مان گئیں"، مسعود نے کہا، اور اس کی گردن پر ہلکی سی چپت لگا کر بولا "اِٹز بیور!"

بلقیس نے بھی مسعود کے ہلکی سی چپت لگا دی، دل دھڑکنے کے بجائے پھڑک اُٹھے، فلیٹ جھولنے لگا، اور بجلی کے قمقمے سے ایک موٹا سا پتنگا ٹن سے ٹکرا کر شیشے سے چمٹ کر رہ گیا۔۔۔ اور پھر پتنگوں کا کوئی دانہ تو مقرر نہیں۔

ساری بلڈنگ میں مسعود کی شرافت، خاموش طبع اور گوشہ نشینی کے

چرچے ہو رہے تھے، ہوٹل والا خاص طور پر مسعود کی دیانتداری اور نجابت کا معترف تھا، بلڈنگ کے مالک نے بھی ایک مرتبہ مسعود سے کہا تھا " مسعود صاحب آپ پہلے مجرد ہیں، جو اس بلڈنگ میں آکر فرشتے کے فرشتے بنے رہے ورنہ یہاں تو جو بھی آیا، کوئی گل کھلا کے ہی نکلا۔ میں تو ان مجردوں سے تنگ آچکا تھا۔ مگر آپ نے ـــــ " اور اس نے رُک کر ایک گوری چٹی سائیکل سوار لڑکی کو یوں تن کر آنکھ ماری تھی، کہ اگر لڑکی میں ذرا بھی حیا ہوتی تو بجلی کے کھمبے سے جا ٹکراتی۔

سلطان کو گئے پانچ مہینے ہو چکے تھے کہ ایک روز اچانک اس کی چٹھی آنکلی " میری ماں فوت ہو گئی ہے اب سوائے آپ کے میرا اس دنیا میں کوئی نہیں، میں بہت جلد آپکی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

مسعود سلطان کو روکنے کی سبیل سوچنے لگا۔ کوئی تجویز نہ سوجھی، دیر تک کمروں میں ٹہلتا رہا، کھڑکی کے قریب بیٹھ کر سامنے کوٹھی کو دیکھتا رہا جس کے برآمدے کا ٹاٹ مدت سے اٹھ چکا تھا۔ اور جہاں اب گوری پنڈلیوں کے بجائے درزی ملیشے خاکی وردیاں سی رہے تھے بلقیس سڑک پر ایک خانچے والے سے خطائیاں خرید رہی تھی اور بلڈنگ کا مالک ایک اینگلو انڈین لڑکی کو سگریٹ پیش کر رہا تھا۔

لیکن سلطان اس کے دماغ پر اس شدت سے سوار ہو چکا تھا کہ باہر کی دلچسپ دنیا کی کوئی چیز اُسے بھلی نہ لگی۔ اس پریشانی کے عالم میں بلقیس کا سامنے آجانا سونے پر سہاگے کا کام کر گیا۔ وہ آج اپنے خاص وقت سے چار پانچ گھنٹے قبل ہی چھت پر چڑھ گیا۔ بیپل کے درخت پر بہت سے پرندے بیٹھے تھے، آسمان بالکل صاف تھا، چیلوں کے ساتھ ساتھ زرد رنگ

کے چند طیارے بھی اڑ رہے تھے، وہ چھت کے ایک سرے پر جا کر پلٹا سامنے دیکھا تو سنہری دانتوں والی پڑوسن ستاروں سے بھرپور دوپٹہ اوڑھے حدِّ فاصل پر ٹھوڑی رکھے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

زرد رنگ کا ایک ہوائی جہاز ہوا میں پلٹے کھاتا اچانک سنبھلا اور اُس کے سر پر سے چھلاوے کی طرح گزر گیا۔ پیپل پر بیٹھے ہوئے پرندے پتوں کی طرح ہواؤں میں بکھر گئے، مسعود کے سوچوں کی طرح! ــــ اُس نے بے پروائی سے پلٹ کر نیچے سڑک کو دیکھا۔ بلقیس خطائیاں لے کر واپس آرہی تھی اور بلڈنگ کا مالک اینگلو انڈین لڑکی کے سائیکل کو اپنے نوکر کے حوالے کر کے اُسے موٹر نکالنے کے لئے کہہ رہا تھا۔

لیکن مسعود کو تو سلطان کی آمد کا خیال مارے ڈالتا تھا۔ وہ پھر چھت پر ٹہلنے لگا، آپ ہی آپ اس کی نظریں حدِّ فاصل کی طرف اُٹھ گئیں۔ گورا چہرہ اپنے چمکتے ہوئے دانتوں سمیت دکھائی پڑا تھا، مسعود نے اب کے جرأت سے کام لیا اور اُسے گھور کر بولا۔ "کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟"

پڑوسن نے اپنے فلیٹ کے دالان میں نظریں دوڑا کر کہا۔ "دیکھ رہی ہوں کہ آپ وہ گھڑی کیوں نہیں باندھتے؟"

"کونسی گھڑی؟" مسعود کو دھکا سا لگا۔

"اور یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ وہ ریشمی رومال آپ شاید استعمال نہیں کرتے"

"کونسا رومال؟"

"اور آپ نے وہ سینٹ تو کبھی لگائی ہی نہیں، جس کے ایک قطرے سے سارا دل مہک اُٹھے؟"

"سینٹ؟" مسعود نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا،

اور وہ بولی "اچھا تو آپ کو یہ چیزیں ملی ہی نہیں، معاف کیجئے گا۔ میں نے خوا مخواہ آپ کو گھبرا دیا۔" اور پلٹ کر اس نے دالان میں جھانکا۔ "بلقیس"

"جی آئی" آواز آئی۔

"نہیں نہیں، وہیں ٹھہرو۔" پڑوسن چلائی۔ اور پھر حواس باختہ اور پریشان نیچے اُتر گئی۔

مسعود بھی فوراً اپنے فلیٹ میں آ گیا، کیونکہ حالات کے اس عجیب و غریب پلٹے کے بعد اسے پناہ کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد ساتھ کے فلیٹ سے جو شور اٹھا ہے، اور اس میں "مسعود صاحب۔ مسعود صاحب" کے نعرے بلند ہوئے ہیں، تو کچھ دیر تک مسعود اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھا۔

"اپنا نام کر کے دیتی رہی ہے، چوری کر کے تحفے بھیجتی رہی ہے مسعود صاحب کو۔ لے آ سب چیزیں لے آ، واپس لے آ سب کچھ" ـــــ اور پھر دھم دھم کی آوازیں، جیسے اناج سے بھری ہوئی بوری کو کوٹا جا رہا ہو۔

لیکن بلقیس بالکل خاموش تھی، کچھ دیر کے بعد دھڑام سے پڑوس کا دروازہ کھلا، اور روتی بسورتی ہوئی بلقیس سیڑھیاں اُترنے لگی۔

لپک کر مسعود نے اس کے تمام تحائف کی پوٹلی اس کے ہاتھ میں ٹھونس دی۔ وہ رک کر آنسو پونچھنے لگی، پلٹ کر دروازے تک آئی، پوٹلی کو ٹھا کر ستایا پڑوسن کے قدموں میں دے مارا، اور پھر سیڑھیوں کا رُخ کرتے ہوئے مڑ کر مسعود کی طرف بدلتی ہوئی آنکھوں سے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہے "تم نے تو میری چیزیں واپس کر دیں ـــ مگر میں جو تمہاری امانت چرا لے پھرتی ہوں اس کا کیا ـــــ"

"ارے سنہری دانتوں والی پڑوسن چلی آئی۔" اب دفع بھی ہو حرامزادی خوامخواہ مجھے بھی اور مسعود صاحب کو بھی بدنام کر رہی ہے۔ دور بھی ہو نظروں سے۔"

اور جب کچھ دیر کے بعد سلطان آ نکلا تو مسعود سے بڑے تپاک سے مل کر بولا۔ "یہ پوٹلی پڑی تھی دہلیز پر ـــــــ اور ہاں حضور سنا ہے وہ پڑوس کی نوکرانی چوری کے الزام میں نکال دی گئی، آپ کی تو کوئی چیز نہیں لے گئی؟"

اور مسعود نے تازہ اخبار کو پرزے پرزے کر کے نالی میں پھینکتے ہوئے کہا "کل سے کوئی دوسرا مکان تلاش کرو۔ یہاں کے نلوں کا پانی کھارا ہے!"

انصاف

ایک ننھا سا کیڑا پتے پر سے پھسلا۔ اُس نے اپنے جسم کے ہر ننھے عضو کو پتے سے چمٹ جانے کے لئے اکڑا لیا۔ لیکن بے چارہ منہ کے بل نیچے ندی میں گر گیا۔ دو ایک ننھے سے بل کھا کر تڑپا اور پھر تنکے کی طرح لہروں پر اچھلتا ہوا دور نکل گیا۔

نیاز احمد محویت میں مٹی سے بھری ہوئی چھنگلیاں دانتوں میں دبائے بیٹھا رہا۔ اور جب ندی کنارے کی مٹی کی مخصوص سوندھی سوندھی بو اس کے دماغ میں بس گئی۔ تو وہ ایک لمبی سانس لے کر اٹھا اپنی ننھی سی ناک اوپر چڑھا کر بھووں کے پاس لے آیا اور ندی میں زور سے تھوکا۔ آستین سے ہونٹوں کو مل مل کر دانتوں کو کھجایا اور چپ چاپ اپنے

گھر آگیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور ماسٹر جی نے اُسے تین سو ننانوے سوالات حل کرنے کے لیے دیے تھے جس روز جیل انٹی ہنرسنگ کی ہلدی والا جمپر چڑھا کر کمرے میں داخل ہوا اور ماسٹر جی با آوازِ بلند پکارے کہ پندرہ جولائی سے پندرہ ستمبر تک اسکول بند رہے گا۔ اُس دن نیاز احمد کا بس چلتا تو اچھل کر کمرے کی چھت پر مکڑیوں کے جالے چھو آتا۔ لیکن بس نہ چلنے پر بیچارہ بدلا کر رہ گیا۔ ور جوشِ مسرت میں پنسل پر اس قدر زور دیا کہ سکہ تڑاخ سے ٹوٹ کر ماسٹر جی کے سامنے جا گرا۔

"کس نے کی ہے یہ شرارت" ماسٹر جی نے اس زور سے نتھنے پھیلائے کہ ان کے اندر بالوں کا ایک جنگل صاف نظر آنے لگا۔

لڑکے سہم گئے۔ نیاز احمد نے پنسل کو شلوار کے نیفے میں اڑس لیا۔ تلاشی ہوئی نیاز کے پاس پنسل سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ مجرم کیسے بنتا۔ بدقسمتی سے موہن کی پنسل ٹوٹی ہوئی تھی، ماسٹر جی نے اُسے دونوں کانوں سے پکڑ کر اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "ابے تربوز! تو بھی شرارتیں کرتا ہے؟"

موہن اپنے سوجے ہوئے سرخ گالوں کو سہلاتے ہوئے بولا "دو ماتا شلوار میں ازار بند ڈالنے لگی۔ کہ سکہ ٹوٹ گیا۔ ایشور کی قسم پنسل ماتا نے توڑی ہے"

"ماتا کا بچہ!" ماسٹر جی نے اُسے بنچ پر پٹختے ہوئے کہا۔

موہن کی کمر پر جیسے کسی نے مگدر جما دیا۔ بس چیخنے لگا۔ "بڑا آیا وہاں سے نارمل کی سند لے کر۔ ابا کے سامنے آئے، تو وہ انگریزی سے اس [illegible] میری کمر توڑ ڈالی ہے۔"

نیاز موہن کی تکلیف دیکھ کر بے کل ہو گیا۔ اٹھا نیفے سے پنسل اٹھا کر ماسٹر جی کے سامنے دھر دی۔ اور کہا "سکہ مجھ سے ٹوٹا ہے۔ اس میں موہن کا قصور نہیں"۔

ماسٹر جی بے اختیار مسکرا کر رہ گئے اور کہنے لگے "شاباش بچے، تو ایک دن مصنف بنے گا۔"

نیاز کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ لڑکے اُسے احترام کی نظروں سے دیکھنے لگے نیاز کو اپنا بنچ ساری جماعت سے اونچا نظر آنے لگا۔ ماسٹر جی کی کرسی سے بھی اونچا!

اور اسی لئے اس روز سبز کیڑے کی بے بسی دیکھ کر اُس کا ننھا سا دل بے کل ہو اٹھا۔

جب نیاز بی۔ اے پاس کرنے کے بعد تھانیداری کے لئے پھلور بھیج دیا گیا تو ماسٹر جی کی پیشگوئی اُسے اچھی طرح یاد تھی۔ وہ سوچتا رہا "آخر تھانیدار اور مصنف میں فرق ہی کیا ہے۔ دونوں قانون کے نگہبان، حق کے ساتھی، سچائی اور انصاف کے علمبردار! آخر تھانیدار اور مصنف میں فرق کیا ہے!"

ایک سال تک پھلور کے کھلے میدانوں میں دوڑتے دوڑتے اُس کے پٹھوں میں فولادی قوت آ گئی اور شانوں کی مچھلیاں اُبھر آئیں۔ جیسے لوہے کے رسّے لپیٹ دیئے ہوں، صاف اور سرخ چہرے میں آنکھیں سمندر کے ساحل پر بکھری ہوئی سیپیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ چوڑی چھاتی، گٹھا ہوا بدن، کھچا ہوا قد! واپس گھر آیا تو دیکھنے والوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ "ہائیں! کیا یہ نیاز احمد ہی ہے!" ہر ایک تعجب سے چلّا اُٹھا!

اور نیاز اترا اکڑتا ہوا اپنے شہر میں گلیوں کے چکر کھاتا اور سوچتا: "اب حق زندہ ہوگا۔ اب انصاف سکون کی سانس لے گا۔ اب قانون کروٹ بدلے گا۔"

نیاز ضلع کے صدر مقام میں مقرر کر دیا گیا۔ چند دنوں کے بعد اسے ایک مقدمے کی تفتیش کے لئے انتخاب کیا گیا۔ شہر کے گندے نالے کے کنارے پولیس کو ایک لاش پڑی ملی تھی اور چند قدموں کے مبہم نشانات کے سوا اور کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے قاتل کا سراغ مل سکتا۔ نیاز نے موقع پر جا کر پوری کوشش سے تفتیش شروع کر دی۔ شہر سے لیکر گندے نالے تک دو آدمیوں کے قدموں کے نشانات کے سوا اور کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے قاتل کا سراغ مل سکتا ...... ایک جگہ ایک شخص کے قدم مڑ جاتے تھے، اور شہر کے قریب جا کر پھر واپس اسی جگہ آن ملتے تھے اور گندے نالے کے عین کنارے پر دو اشخاص کے گتھم گتھا ہونے اور لڑنے کے الجھے ہوئے نشانات تھے، پھر خون کے چھینٹوں کے نشان اور دو ہی قدم پر ایک خون آلود نعش، جس کے قلب میں ایک چھرا نصف دستے تک گھسا ہوا تھا۔ کھوجی بلوا لئے گئے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ مقتول کو اکیلا چھوڑ کر قاتل کا واپس شہر آنا اور شہر کے قریب پہنچ کر اچانک لوٹ جانا اور اسے قتل کر ڈالنا کیا معنی رکھتا ہے!

مقتول کی شناخت ہو گئی، وہ شہر میں ایک وکیل کے پاس ملازم تھا وہاں جا کر پوچھا گیا کہ پچھلے دو چار دنوں میں مقتول کے پاس کون اجنبی شخص آیا تھا۔ ملازموں نے بتایا کہ ایک سانولے رنگ کا نوجوان، جو اب بھی مکان کے پچھواڑے گھر کے دوسرے ملازموں کے ہمراہ بیٹھا ہے آٹھ روز ہوئے مقتول کے پاس آیا، اور اسی کے ہاں ٹھہرا رہا

اب بھی کل سے اس کا منتظر بیٹھا ہے اور اس کے نہ آنے کی وجہ سے
بے حد پریشان ہے۔

نیاز نے ملازموں کے کوارٹروں کی طرف جاکر اللہ داد کو دبوچ لیا
اور کوتوالی میں لاکر اس کی خوب مرمت کی، مگر وہ چلائے جا رہا تھا۔
"میں مقتول کا بہت عزیز دوست ہوں اور میں اُسے ملنے کیلئے
دس دن کی چھٹی لیکر یہاں آیا ہوں، وہ کل کسی گاؤں میں ایک کام
کے لئے گیا۔ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ شام کو واپس آجائیگا، لیکن
وہ آج دوپہر تک واپس نہیں آیا مجھے نہیں معلوم اُسے کس نے قتل کیا
ہے؟ مجھے مارنے سے پہلے مجھے اس کا چہرہ دکھا دو۔ ہائے میرا مظلوم بھولا بھالا
میرا دوست!"

نیاز کے گھونسوں اور سپاہیوں کے بھاری بھرکم بوٹوں کی ٹھوکروں نے اُس پر کوئی اثر نہ کیا اور وہ برابر چلاتا رہا، "مقتول کی
لاش میرے سامنے لاؤ، پھر بے شک مجھے گھونسوں سے بھرتہ بنا ڈالنا!"
لیکن نیاز کو حق بات کی تلاش کی دھن تھی۔ مارتے مارتے خود تھک گیا اور
سستانے کیلئے بیٹھا تو معاً اُس کے دل میں ایک خیال آیا۔ نہایت دلاسے
سے اللہ داد سے پوچھا۔ "اے بھائی، اب ہماری ہمت جواب دے گئی
ہے، ہمیں صرف اتنا بتا دے، کہ مقتول کا گھر کہاں ہے؟ اور اس کے
کوئی اہل و عیال بھی ہیں؟"

اللہ داد کے زرد چہرے پر سرخی آگئی، اور اس کا جسم جو گھونسوں
کی بوچھاڑ سے اکڑ کر مرجھا گیا تھا، پھول کی طرح کھل گیا۔ وہ بولا۔
"تھانیدار جی آپ نے میری آزادی کی سبیل خود پیدا کر دی، میرے

مرحوم دوست کی بیوی خود گواہی دے گی۔ کہ مجھ سے زیادہ اُس
بیچارے کا کوئی عزیز نہ تھا۔ آپ اُسے بلوا بھیجئے۔ میں کوئی اور گواہ
نہیں چاہتا۔"

اور آخر سرکاری ذریعے سے مقتول نورالٰہی کی بیوی بلالی گئی
نیاز احمد کرسی پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ کہ اگر اُس عورت نے بھی
اس شخص کے خلاف کچھ نہ کہا، تو پھر ثبوت کیسے مہیا ہوگا؟ اسکی پہلی
کوشش کیسے کامیاب ہوگی؟ آج اُسے اپنے بوڑھے استاد کی
پیشگوئی کی صداقت دنیا پر ظاہر کرنی تھی!

چق کو حرکت ہوئی، اور ایک نازک کنول کے پھول سا پاؤں
کمرے میں داخل ہوا۔ روئی کے گالوں کی طرح بے آواز۔ نیاز احمد کی
نبضیں جن میں تلاطم جوش مار رہا تھا۔ اچانک کسی اور دھن میں
دھڑکنے لگیں اور جب اُس نے آنکھ اٹھا کر سامنے دیکھا تو سمجھا گویا
اس کا دماغ سُن ہو کر رہ گیا ہے! اُس کی انگلیاں ڈھیلی پڑنے لگیں
اور قلم چھوٹ کر صاف قمیص پر چھینٹیں ڈالتا فرش پر گر پڑا اور روشندان
میں ایک نیلے کبوتر نے گردن کھینچ کر کہا۔ "غٹرغوں! غٹرغوں!"۔۔۔
جیسے "ہوشیار" کا ایک نعرہ لگا کر پہرہ دار غافل دوکانداروں کو جگا
دیتے ہیں۔

نیاز احمد نے رومال سے پیشانی کو پونچھا اور پلکوں کی آڑ سے اُسے
پھر دیکھا۔ حسن اور جوانی کا مجسمہ نظریں نیچی کیے اپنے دائیں ہاتھ سے
بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کو دبا رہا تھا! نیاز احمد نے فرش سے قلم اٹھاتے
ہوئے کہا۔

"لڑکی! آپ ۔۔۔" اُس نے اُسے لڑکی کہہ کر پکارا کیونکہ ابھی تک وہ عورت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اُس کے چہرے پر رنگ تھا، بالوں میں چمک تھی۔ آنکھوں میں جادو تھا۔ اعضا میں غیر محسوس لچک تھی اور سانس لیتے ہوئے اس کے سارے جسم میں مبہم سا لوچ پیدا ہو جاتا تھا!

"لڑکی! تو مقتول نور الٰہی کی بیوی ہے؟"

لڑکی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اُس نے آنسو روکنے کے لئے منہ میں اپنا سبز آنچل ٹھونستے ہوئے کہا "جی"۔

"سچی بات بتاؤ گی؟"

اُس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "جی" اور ایک آنسو پلکوں سے پھسل کر اُس کے سینے پر گر گیا!

"اللہ داد کو جانتی ہو؟"

"جی"۔

نیاز احمد کی کرسی جیسے ہولناک نیلے سمندروں کی کف آلود لہروں پر ہچکولے کھا رہی ہے، اور "جی جی" کی یہ تکرار! جیسے کوئی مغنی بیٹھے بیٹھے بربط کے ایک ہی تار کو بار بار چھیڑ دیتا ہو!

نیاز احمد نے کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے پوچھا "کب سے جانتی ہو اسے؟"

"بہت دنوں سے"۔

"اور تمہارا نام کیا ہے؟"

"زیبو"

"پورا نام"

"زیبو ۔۔۔ جی"

"آخر تمہارے ماں باپ نے کیا نام رکھا تھا تمہارا؟ پورا نام؟"

"وہ بھی زیبو ہی کہتے تھے!"

نیاز اپنی آنکھوں میں غصے کی جھلک نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا، "یہ تھانہ ہے۔ یہاں جھوٹ نہیں چھپ سکتا!"

اور اس کی ڈبڈبائی ہوئی پتلیاں آنسوؤں کے ایک گہرے پردے میں چھپ گئیں۔ جیسے اس نے اپنی باریک سیاہ بھووں کے نیچے دو سیپیاں رکھی ہوں، سفید اور چمکتی ہوئی، لیکن بصارت سے محروم! اور جب نیاز نے اسے خاموش دیکھ کر کہا، "بولو گی یا نہیں؟" تو خوف سے اس کی پلکیں جھک گئیں اور آنسو اس کے سینے اور فرش پر یوں گرے، جیسے کسی الھڑ چھوکری کی چھٹی ہوئی جیب سے گڑیا کی بالیوں کے سفید سفید موتی اچانک لڑھک کر گلی میں بکھر جائیں!

"اللہ داد سے متعلق تمہیں کوئی شکایت ہے؟"

"نہیں"

"نور الٰہی اور اللہ داد کا آپس میں کوئی جھگڑا تو نہ تھا؟"

"نہیں جی کبھی نہیں!"

"کوئی خاندانی جھگڑا وگڑا؟"

"بالکل نہیں جی!"

"تو تمہیں کس پر شک ہے؟ یہاں اس شہر میں تمہارے خاوند کا کون دشمن ہے؟"

"میں تو گاؤں میں رہتی ہوں۔ میں ادھر کبھی نہیں آئی!"

نیاز احمد نے سوچا، یوں کام نہیں بنے گا، ان نرم نرم باتوں سے عورت کے دل کی خلوت سے اتنا بڑا راز اگلوایا نہیں جا سکتا اور پھر عورت پر ہاتھ کون اٹھائے، انصاف کو ٹھیس لگے گی!

وہ دفتر سے اٹھ کر گھر آیا۔ دیر تک بیٹھک میں بیٹھا سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے، اگر وہ ناکام رہا تو اپنے بڑے افسروں کو کیا منہ دکھائے گا، جہاں کہیں وہ نظر پڑیں گے اُن سے کترانے کی کوشش کریگا، سپاہی اُسے یوں ڈٹ کر سلام نہ کریں گے، جیسے آجکل کرتے ہیں۔ اُس کے اس لمبے قد اور وجیہہ چہرے کی کوئی وقعت نہیں رہ جائیگی! اب کیا کیا جائے؟

اچانک اُس کے جی میں یہ تجویز آئی، اور وہ کرسی پر اچھل پڑا! اس نے اٹھ کر سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے لوبنے اڑاتا ہوا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے پر تبسم تھا، اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک! جیسے برسات کی اندھیری راتوں میں جگنو چمکتے ہیں!

زیبو اُس رات نیاز کے گھر سوئی۔ نیاز کی بیوی نے اسکی خوب خاطر مدارات کی، اور اس کی دلدہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور جب صبح وہ کسی کام کے لیے باہر نکلی تو بیٹھک میں اُس نے نیاز پر نگاہیں گاڑ دیں اور دور تک آنچل سنبھالنے کے بہانے پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی گئی۔

نیاز احمد کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی، ہونٹ اور کھل گئے! کامیابی اور کامرانی کی دیوی اُس کے تصور کے آنگن میں رقص کرنے لگی، اس کے گھنگھروؤں کی جھنجھناہٹ اور مڑی ہوئی ہتھیلیوں کی جادو بھری جنبش! ـــ کنول کے ڈنٹھلوں ایسے بازوؤں کا لوچ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے ساری کائنات اس کی باہوں کے اوپر نیچے ہونے سے کسی

پریشان دل کی طرح دھڑک رہی ہے۔

اور جب زیبو لوٹی، تو نیاز بیٹھک کے دروازے پر کھڑا تھا وہ اسکے قریب سے گزری تو نیاز نے دھیمی اور پیار بھری آواز میں کہا "زیبو رانی!"

زیبو ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور نیاز کی طرف یوں دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے جانے بوجھے اُس کے پاؤں پر پاؤں رکھ دیا ہے۔

زیبو رانی نیاز نے یہ الفاظ اُسی انداز میں دہرائے۔ زیبو کی پلکیں جھک گئیں، انگلیوں میں لرزش سی پیدا ہو گئی۔ جسم میں ایک تھرتھری سے دوڑ گئی۔ آنکھیں بھتیری گئیں۔ بولی "جی!"

"زیبو رانی"

اب تو نیاز بیٹھے بیٹھے اچھل پڑتا۔ سوتے سوتے گانے لگتا۔ اور کامیابی کی دیوی اپنی انگلیوں کی پوروں میں اپنے باریک لہنگے کے دامنوں کو تھامے تھرکتی ہوئی اُس کے دماغ کے پردے پر سے گزر جاتی! کپتان پولیس جیسا سگار سلگاتے اور مسکراتے ہوئے اس کے دماغ کی شریانوں میں گردش کرنے لگتے۔

ایک ہفتہ کے اندر اندر نیاز نے زیبو پر ایسے ڈورے ڈالے کہ وہ ایک بے بس ہرنی کی طرح اُس کی ہو کر رہ گئی۔ ایک صبح نیاز نے زیبو کے بالوں کو اپنی انگلیوں پر لپیٹتے ہوئے کہا "دیکھو زیبو۔ تقدیر کی بات۔ تم کہاں کی رہنے والی ہو اور میں کہاں کا۔ تقدیر ہمیں اس قدر قریب لے آئی کہ اب ہم ایک دوسرے سے دُوری کو موت کا پیغام سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟"

زیبو نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر آنکھوں سے تبسم برساتے ہوئے کہا "ہوں!"

"اچھا تو زیبو۔ کیا آج بھی تم مجھے اتنا نہ بتا سکوگی کہ تمہارے خاوند کا قاتل کون ہے؟"

"اللہ داد"

نیاز نے چاہا کہ کامیابی کا ایک فلک شگاف نعرہ لگا دے۔

"کیسے؟"

زیبو نیاز کے گھٹنے کو تکیہ بناتے ہوئے بولی "میرا خاوند بہت بدصورت اور گندہ شخص تھا۔ میری اُس سے کبھی نہ بنی۔ اس اللہ داد سے میں نے وعدہ کیا کہ اگر وہ اُسے جاکر قتل کر ڈالے تو میں اُس سے بیاہ کر لوں گی۔ میں اصل میں اپنے خاوند سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میں نے یہاں اللہ داد سے سب باتیں پوچھ لی ہیں۔ وہ یہاں آیا۔ سات آٹھ دن رہا۔ آخر وہ ایک رات دریا کی سیر کے لئے باہر لے گیا۔ گندے نالے کے کنارے لے جا کر اُسے چھوڑ کر کسی بہانے سے واپس ہو لیا۔ وہ اس کا نہایت عزیز دوست تھا اور اس وقت اُسے اپنا ضمیر اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اپنے بچپن کے دوست کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرے لیکن شہر کے قریب پہنچ کر میرا خیال اُس کی اُس محبت پر غالب آگیا اور واپس جاکر اُس نے اُسے قتل کر ڈالا۔"

نیاز نے پیار سے زیبو کے ہاتھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "تو کیا زیبو تم پرسوں عدالت میں اس کا اقرار کر لوگی؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور دیکھو، فیصلے کے بعد ہم دونوں اکٹھے رہیں گے۔ میں مر کر بھی اپنے آپ کو تم سے جدا نہیں کر سکتا۔"

اور تیسرے دن عدالت میں جاکر زیبو نے اقرار کر لیا کہ اللہ داد کی اس

کے مقتول خاوند سے زبردست دشمنی تھی اور اُس نے ہی اُسے قتل کیا ہے
اللہ داد یہ سُن کر کٹہرے میں دھڑام سے گر پڑا۔ اُس کا ایک ہاتھ کٹہرے
کے جنگلے سے نیچے لٹک کر یوں حرکت کرنے لگا۔ جیسے زیبو پر لعنت بھیج
رہا ہے۔ کپتان پولیس نے نیاز کی زبردست سفارش کر دی۔

دن بھر نیاز کے گھر اُس کے دوستوں اور عزیزوں کا تانتا بندھا رہا۔
اتنے پیچیدہ مقدمے کی ایسی قابلِ تعریف تفتیش آج تک کوئی تجربہ کار
سے تجربہ کار تھانیدار بھی نہیں کر سکا تھا۔

وہ سورج چھپنے سے ایک گھنٹہ قبل بیٹھک میں اکیلا بیٹھا تھا کہ دروازے
کا پردہ ہلا اور زیبو اندر داخل ہوئی۔ نیاز اُٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی نظروں سے
اُسے گھورنے لگا۔

زیبو آگے بڑھتی ہوئی بولی "اب میرے بارے میں کیا حکم ہے جی"؟
نیاز گھبرا سا گیا بٹوے سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر زیبو
کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو گزارہ نہیں کافی ہو گا کافی دن تک"

زیبو کو جیسے کسی نے اچانک خون چوس لیا ہے۔ وہ سرسوں کے
پھولوں کی طرح زرد پڑ گئی۔ نوٹ نیاز کے ہاتھ سے چھین کر پرزے پرزے
کر کے فرش پر پھینک دیا۔ اور کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ نیاز
بولا "لیکن زیبو تم جانتی ہو، میری ایک بیوی موجود ہے"!

زیبو اپنا آنچل سنبھالتی بگولے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی اور
نیاز دیر تک ریشمی پردے کو لرزتا ہوا دیکھتا رہا!

حق کا پرستار اور انصاف کا علمبردار نیاز جب شام کو ٹہلنے کے
لئے باہر نکلا۔ تو دریا کے کنارے اُس نے ایک ننھے سے سبز کیڑے

کو دیکھا۔ جو تتے سے پھسلا۔ اُس نے اپنے جسم کے ہر ننھے عضو کو تتّے سے چمٹ جانے کے لیے اکڑا لیا۔ لیکن بے چارہ منہ کے بل نیچے ندی میں گر گیا! دو ایک ننھے سے بل کھا کر تڑپا اور پھر تنکے کی طرح لہروں پر اچھلتا ہوا دُور نکل گیا۔

مہنگائی الاؤنس

اِدھر لالہ مراری لال نے ہیڈ کلرکی کا عہدہ سنبھالا، اُدھر اُن کے مزاج کا ایک چھلکا اُتر گیا۔ ہر وقت ہنستے، مسکراتے، گپیں ہانکتے لالہ مراری لال نے ایسی قلا بازی کھائی، کہ دفتر والے دم بخود رہ گئے۔ اب لالہ جی بات بات پر میز پر گھونسہ جمانے لگے۔ عینک کو ناک کے بانسے پر سرکا کر اور بھووں کو ماتھے کی لکیروں میں پھنسا کر کلرکوں کو گھورتے، ہر چپراسی کو الّو کا پٹھا کہہ کر پکارتے۔ بازار سے گزرتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے بدہضمی کے مریض ہیں۔ کوئی دکاندار سلام کرتا تو سر کو خفیف سی جنبش دے کر جواب دیتے "ہوں"۔۔۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ "تجھے کس نے کہا تھا سلام کرنے کو!"۔۔۔ ایک دن جونہی گھر میں قدم رکھتے اور کرسی کو چھو کر میں بیٹھے تھے

دیکھتے. تو ان کا سارا نشہ جھاگ کی طرح فش فش بیٹھ جاتا اور وہ بچوں کے سے بھولپن سے کہتے "بیٹھی ہو کسم؟"

کسم نے ابھی تک اپنے اور اپنے پتی کے سن میں بیس برس کی طویل مسافت نہیں کاٹی تھی. اُس نے اس صحرا کا تھوڑا سا فاصلہ ہی طے کیا تھا اس لئے بجائے اس کے کہ مسکراتی ہوئی اٹھتی اور آرام کرسی پر بکھرے ہوئے لالہ جی کی گدگدی پنڈلیوں کو سہلاتی. وہیں چولھے کے قریب گھونگھٹ نکالے دستپناہ سے ٹھا کر راکھ کو الٹتی پلٹتی. انگارے پر انگارہ دھرتی. ہنڈیا کے پیندے پر جمی ہوئی تہیں کھرچتی اور آنکھوں میں رس اور باہوں میں مس کی تمنائیں گھول کر تکان کی نامکمل انگڑائی لیتی اور پھر سینے پر اٹکے ہوئے دوپٹے کو مبہم سے جھٹکے سے گرا کر کہتی "جی بیٹھی ہی ہوں آپ کہیں تو کھڑی ہو جاؤں نا!"

"واہ" لالہ مراری لال کان سے میل نکال کر چھنگلیا کو آرام کرسی کے میلے ٹاٹ پر مل دیتے "میں تو چاہتا ہوں. تم بیٹھی ہی رہا کرو۔"

کسم کے گالوں پر گلاب کھل جاتے۔ لہجے میں لچک اور آواز میں جھجک پیدا کر کے کہتی "یعنی لولی لنجی ہو کر رہ جاؤں نا!"

لالہ جی تالی بجا کر ہنستے. الگنی سے لٹکے ہوئے پنجرے میں خواب دیکھتا ہوا طوطا چونک کر کہتا "دا رے نیارے. وارے نیارے" اور لالہ جی پاجامے پر دھوتی باندھ کر نیچے سے پاجامے کو سرکاتے ہوئے کہتے. "دیکھو یارے لول سمجھا دے طوطے کو. تمہارے آنے سے پہلے جانتی ہو یہ کیا کہتا رہتا تھا؟ کہتا تھا "مر جا. مار دے. مر جا. مار دے" لیکن اب تو پچھا بند دنوں سے کوئی بن رہا ہے کمبخت!" کچھ سوچ کر کہتے. "کسم تم میرے

ساتھ واک "پر چلا کرو"۔

"جی معاف کیجیے" کسم دست پناہ ٹانے چھوڑنے لگتی۔ "آپ جایا کیجیے واک پر، میرے نصیبوں میں تو اس ہرے ہرے کوی مہاراج کی گوتا سننا ہی لکھا ہے"۔

اچانک باہر سے لالہ امیر چند کی آواز آتی۔ "چلو واک پر چلیں مراری"۔

اور لالہ مراری لال مشش سالہ گرگابی میں ایک چیتھڑا رکھتے ہوئے جواب دیتے۔ "دو منٹ ویٹ کرو امیر چند۔ کمبخت پمپ شو میں ایک کیل اُبھر آئی ہے"۔ پھر ہولے سے کسم کو چھیڑتے۔ "اندر چلے آئیں لالہ امیر چند؟"

"جی معاف کیجیے"۔ کسم لالہ جی کو پمپ شو سے لے کر کنپٹیوں کے سفید بالوں تک دیکھتی۔ "وہ اتنے بڑے ہو کر بھی مذاق سے باز نہیں آتے"۔

"مجھ سے تو چھوٹے ہیں" لالہ مراری لال گرگابی میں پاؤں یا پاؤں میں گرگابی گھسیڑتے ہوئے کہتے۔

اور کسم کہتی "ابھی پچھلے دنوں ہی میری ایڑیوں پر ہاتھی دانت کی گیندوں کی پھبتی کسی۔ اس کے بعد وہ کشتی والی پھبتی تو آپ کو بھی نہیں بھولی ہوگی۔ سن نہیں دیکھتے اپنا، آنکھوں کے کناروں پر مکڑیاں ٹانگیں پسارے پڑی ہیں، اور چلے ہیں چھیڑ چھاڑ کرنے پرائی بہو بیٹیوں سے"۔

لالہ جی کسم کے گالوں میں جوانی کے گلابوں کے علاوہ غصے کے شعلے دیکھتے تو لہجے میں گھی مکھن ملا کر کہتے "وہ میرے مِتر ہیں کسم۔ اور پھر بڑے بھی ہیں۔ اُن کے بارے میں ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ یہ کیا ظلم ہے کہ جب سے تم نے تیوری چڑھائی ہے۔ میں انہیں اندر نہیں آنے دیتا۔ وہ خود بھی نہیں آتے کہتے

ہاں، کوئی ناگ رانی کی تصویر کھینچنا چاہے، تو کسم بھابی کو ماڈل بنالے۔"

کسم تڑپ اٹھتی "لاج نہیں آتی آپ کو؟"

لالہ مراری لال مسکرا کر چھڑی سنبھالتے اور چوکے کی حد پر رک کر کہتے "اچھا تو اسی وقت، پر لوٹ آئے گے ہم ——— بھوجن تیار ہو گا نا؟" ——— اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر ڈیوڑھی کی طرف پلٹتے اور کہتے "آج فریدر بھی فائن ہے امیر چند آج تو بہت لمبی واک کو جی چاہتا ہے۔"

اور جب لالہ جی چلے جاتے، تو کسم کی رگوں میں جھنجھناہٹیں بیدار ہو جاتیں۔ آنگن کی ویرانی گول مول پرچھائیوں سے بھر جاتی۔ ڈیوڑھی کا ادھ کھلا دروازہ دھڑ دھڑ بجنے لگتا۔ اور لالہ امیر چند کے بالاخانے پر سے اُن کی لڑکی کے دھیرے دھیرے گانے کی آواز آتی۔ تو یہ الاپ اُس کے کانوں کے قریب کوئی آسیبی رقص کرتی۔ وہ منڈیرا کے ڈھکنے کو کھسکا کر بڑبڑاتے ہوئے آلوؤں کو چمچے سے الٹتی پلٹتی۔ رکی ہوئی بھاپ راستہ پا کر اُبھرتی۔ اور کسم کے گرد و پیش کو نم آلود کرتی ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔ اٹھ کر وہ طوطے کو پنجرے کی سلاخوں سے اکساتی۔ وہ اپنے پروں کو پھیلا کر اور چونچ کو کھول کر چلّاتا "وارے نیارے وارے نیارے۔"

"رام رام کر،" کسم سلاخوں پر دستِ ناز بجا کر کہتی "رام نام کے جاپ میں مکتی ہے نگوڑے۔ بول رام رام۔"

"وارے نیارے،" طوطا سلاخوں سے چمٹ کر بلبلاتا۔

"رام رام"

"وارے نیارے"

اور وہ انگلیوں کی گلابی پوروں کو سہلا کر سوچتی "نوبکو اُسی ہے جاتے

کون بُری گھڑی تھی۔ کہ تجھے یہ بول سکھا دیئے۔ یہاں وارے نیارے نہیں ہوتے۔ یہاں لمبی لمبی واکیں ہوتی ہیں۔ اس راکھشش امیر چند کے ساتھ جو ہنستا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے بڑا سا پھوڑا پھس پڑا ہے"!

جب لالہ مراری لال نے پہلی پتنی کے سوگ سے فارغ ہو کر کسم کے معاملہ میں سلسلہ جنبانی شروع کی۔ تو ان کے لئے ہیڈ کلرکی کی سفارش ہو چکی تھی۔ یہی سفارش دراصل اس بیاہ کی سفارش ثابت ہوئی۔ اور پھر لالہ جی سارے شہر میں اپنی زندہ دلی کے لئے مشہور تھے۔ اُن کے قہقہوں کی فلک شگافی ضرب المثل بن چکی تھی۔ چٹکلے سن کر یا سنا کر سامنے پڑی ہوئی میز پر اس زور سے گھونسے جماتے، کہ سوڈا واٹر کی بوتلیں جلترنگ سے بجانے لگتیں۔ اور شیشے کے گلاس لڑھک جاتے۔ جوانی کا عمر سے تو کوئی لگاؤ ہی نہیں۔ یہ تو مزاج کی گھلاوٹ سے عبارت ہے۔ اور لالہ مراری لال کے مزاج میں تو پھلجھڑیاں اور پھول کھلے ہوئے تھے۔ پہلی پتنی سے اُن کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن وہ کبھی اداس نہ دیکھے گئے۔ کہتے تھے "جب ایشور دے گا تو ہمیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اور دھم سے آجائیگا ایک ہتھن متھنا سانولا سلونا بچہ۔ —— آخر اس میں فکر کی کونسی بات ہے"!

کسم کے پتا نے لالہ مراری لال کے سن کے بد نظر ایک مرتبہ اعتراض کیا تو تھا۔ مگر کسم کی ماتا بھڑک اٹھی تھی۔ "واہ میں نے تو جب بھی دیکھا ہے مراری کو یوں لگتا ہے جیسے آپ ہی کھوٹے سکے پھر رہے ہیں"!

کسم کے پتا کو اپنی مونچھوں میں کہیں سفید تاروں کا احساس تھا۔ مگر وہ اس غیر محسوس عذر گناہ کا کوئی رد بلیغ نہ کر سکے اور اپنی چھڑی کو بے تابانہ گھماتے خاموش ہو رہے۔

کسم نے بھی اندر ہی اندر کئی بل کھائے تھے۔ بیماری کا بہانہ کیا تھا۔ اور پھر سچ مچ بیمار بھی ہو گئی تھی۔ ماتا کو کئی چپ چاپ اشارے کیے۔ میلے بباسوں بکھرے بالوں اور مری مری مسکراہٹوں کے کئی تیر چھوڑے، مگر وہاں تو لالہ مراری لال کے سر پر متوقع ہیڈ کلرکی کا مکٹ اُن کے چہرے پر بچپنے کی معصومیت برسا رہا تھا! کسم کو کونین کھلائی گئی، جو شاید بے بلائے آگئی تو کسم نے سوچا کیوں نہ بھری برادری میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دوں، اور بیچ چیخ کر کہہ دوں کہ نہیں کرتی شادی، میں ایشور کی بھگتی کروں گی۔ دیوداسی بنوں گی، مجھے مکتی چاہیئے! — مگر یہ الفاظ اس کی اُن نبضوں ہی میں دھڑکتے رہ گئے، جو لنگوٹیاں عجیب عجیب مقامات پر ابھر آتی تھیں۔ آخر نچلے ہونٹ کے خم اور کالوں کی لووں اور انگلیوں کی پوروں میں نبضوں کا کیا گزر۔ مگر وہ تو کئی مرتبہ ایک اچھا خاصا ساز سا بن جاتی تھی، جس کے ہر تار پر کسی ان جانے مضراب کی چوٹ پر چوٹ پڑتی رہتی تھی!

دن کو تو خیر عورتوں کا تانتا بندھا رہتا۔ البتہ رات کو وہ اپنے خیالوں کی محفل سجاتی۔ لالہ مراری لال کتنے نئے نئے اور انوکھے رُوپوں میں آتے، مگر اچانک اس کے چہرے پر ایک استخوانی ہانجالی سی کاڑھنے لگتا۔ اور کسم کروٹ بدل کر نئے خیالوں کو بلا لیتی۔ اُس نے کئی ایسے الادے بھی کیے جو گھر کی کھڑکیوں سے باہر کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ ویران سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے آوارہ نوجوانوں کے گائے ہوئے فلمی گیت اُس کے دل پر دستک دیتے وہ کمرے میں گھومنے لگتی۔ کھڑکی کے قریب جا کر نکڑ کے کنارے بجلی کے کھمبے کا روشن تاج دیکھتی جس کے ارد گرد پتنگوں کا ایک

ہجوم ایک الوٹ دائرہ بنائے رکھتا اچانک اس قہقہے سے لالہ مراری لال چھری سنبھالے نکلتے اور کسم لپک کر اپنے پلنگ پر آ گرتی۔ گٹھڑی بن کر گر پڑتی۔ گھٹنوں کو سینے سے بھینچتی اور جب ساتھ کے کمرے میں اس کے پتا کھانستے باہر سڑک پر نیپالی چوکیدار نیند کی مستی کے عالم میں لوگوں کو ہوشیار رہنے کیلئے کہتا، اور روشندان میں سویا ہوا کبوتر خواب میں گٹکتا، تو کسم کا ماحول سانس لینے لگتا۔ خیالوں کے پتنگے اندھیرے کونوں سے ہمٹ جاتے۔ ایک لمحہ کے لئے وہ اپنے آپ کو اس قربانی کیلئے تیار پاتی مگر اچانک رات کا سکوت دبے پاؤں آتا اور اس کے کانوں کے قریب سرگوشی کرتا: "اب کیا ہوگا!"

آخری روز وہ دن بھر روتی رہی۔ اس کی ماتا کو کچھ شبہ سا ضرور ہوا کیونکہ سوز کی سنجیدگی نے اس کے چہرے کی جھریوں کو گہرا کر دیا تھا۔ مگر اب سوز بچار کا وقت کہاں تھا۔ اب تو گھرانے کی ناک کی فکر تھی۔ جو کٹنے کے لئے ذرا سا بہانہ چاہتی ہے!

لالہ مراری لال کے ہاں آ کر کسم نے دیکھا کہ لالہ جی کچھ ایسے بھیانک نہیں۔ چہرہ سرخ ہے اگر اس پر چیچک کہیں کسی جھری نے جھالر بنا دی ہے، تو کیا۔ جھریاں آخر انسانوں ہی کے چہرے پر پڑتی ہے نا۔ اور پھر لالہ جی کے مزاج کی رنگینی تو کسم کے مرجھائے ہوئے خیالوں کے لئے ساون کی پھوار ثابت ہوئی چند راتیں تو اس نے رنگ رنگ کی خیالی بہشتیں بسانے میں بسر کیں۔ پھر کچھ راتیں چھت کی کڑیاں اور چلمن کی تیلیاں گنتی رہی۔ ایک دو مرتبہ نصف شب کی خاموشی میں کسی بھجن کے ابتدائی بول بھی گنگنائے، مگر اس کے کمرے کی ویرانی میں کوئی فرق نہ آیا۔

نشست و برخاست میں نئے نئے زاویے اختیار کئے، چلتے ہوئے

یوں لچکی، جیسے کہیں سے ٹوٹ جائے گی۔ سانس لینے میں بھی ایک ادا تھی۔ نازک نتھنے یوں پھڑکتے جیسے کسی آوارہ بوند کے گرنے سے پھول کی پتی ہلکی سی پھریری لیتی ہے۔ سینہ یوں اُبھرتا جیسے اُبھرتا ہی چلا جائے گا اور جب یہ سیلاب اُترتا تو معلوم ہوتا، جیسے ساری کائنات کہیں دور خلا میں ڈوبی جا رہی ہے۔ آنکھیں جھپکانے سے پہلے پتلیوں میں نیندیں جھانکتیں۔ اور جھپک کے بعد یہ نیندیں پھیل کر چھٹ جاتیں، جیسے جھاگ کے ہٹ جانے سے سمندر کی تہ میں پڑی ہوئی میلی جھلک اٹھتی ہے، انگڑائی یوں لیتی جیسے فضا میں اُبھر کر تیرنے لگے گی اور پھر ایکدم باہوں کو یوں چھوڑ دیتی جیسے دو ستارے ایک وقت میں متوازی خطوط بناتے ٹوٹ پڑیں۔

اگر لالہ مراری لال کی ماتا زندہ ہوتیں، تو شاید کسم کو رسم و رواج کی بہت سی سولیوں پر لٹکنا پڑتا، مگر یہاں تو بالکل کھلا میدان تھا۔ اور کھلے میدانوں میں اگر ہرنی کسی ٹیلے کی اوٹ میں پڑی رہے، تو لعنت ہے اُس کے ہرنی پنے پر، اور تف ہے اُس کی اُن کلیوں پر، جن میں جوانی ہے، رقص ہے، آہنگ ہے، دعوت ہے، وہ عورت جو فوری پذیرائی چاہتی ہے، چاہے یہ پذیرائی شکاری کے تیر کی ہو، صیاد کے دام کی ہو یا ہرن کے اضطراب کی!

لیکن یہاں تو ابتدائی دنوں میں چند مسکراہٹوں کا سودا ہوا۔ اور پھر لالہ مراری لال کی چھٹی ختم ہو گئی۔ اُسی پرکار کا چکر شروع ہو گیا، جو ہر کلرک کی زندگی کا محور ہے۔ دفتر سے گھر، گھر سے ڈاک پر ——— اور ڈاک سے واپسی پر فائلوں بھری نیندیں۔ اگر مراری لال جی کسم کو دفتر

کی اس گھنٹی کی حیثیت ہی دیدیتے جس کی گردن کو دبا کر لالہ دلی کو
بلایا جاتا ہے، تو بھی غنیمت تھا۔ لیکن کسم بیچاری تو یہاں آتے ہی ہماری
کی نوکری بن گئی۔ ہر وقت قدموں میں پڑی رہتی۔ گلے کا ہار ہے چند منی
منی مسکراہٹیں، چند گھسے پٹے قہقہے، چند مڑی تڑی باتیں بے رس جماہیوں
کی دھجیاں اور بس!

اور پھر لالہ مراری لال ہیڈ کلرک بن گئے تو اچانک اُن کے مزاج
کا ایک چھلکا اُتر گیا۔ خوش مزاجی سانپ کی کینچلی کی طرح اتر گئی۔ اب لالہ
مراری لال دفتر کے فرعون تھے۔ ظاہری آن بان میں بھی تبدیلی نمایاں
ہو گئی۔ جھکی ہوئی مونچھوں نے ننھی سی انگڑائیاں لیں۔ داڑھی ہفتے میں
دو مرتبہ کی بجائے بلا ناغہ صاف کی جانے لگی۔ گول مول پگڑی میں ننھی
سی کلغی بھی ابھر آئی۔ کسم کی امید بندھی پھر وہی خیالی جنتیں بسنے لگیں
لیکن ان جنتوں میں کوئی نہ آیا۔ لالہ مراری لال دفتر سے آکر کسم کے سامنے
بالکل سیدھے سادے مراری لال بن کر رہ جاتے۔ کسم نے جب دیکھا کہ
گھسی ہوئی چول ہے۔ کھاٹ کو مقررہ زاویے پر جمانا مشکل ہو گا، تو چول
کی درزیں بھرنے لگیں۔ ایک بار لالہ جی کے بوٹ اتارتے ہوئے اُن کی
پنڈلی کے بال کھینچ لئے مگر مراری لال ہڑبڑا کر پیچھے ہٹے تو آرام کرسی کا ٹاٹ
دھڑ سے پھٹ گیا۔ اور لالہ جی قلابازی کھا گئے۔ اُٹھے تو گردن کے تناؤ میں
دیر تک جھول سی پڑی رہی۔ کسم اپنے تجربہ کا یہ بھونڈا نتیجہ دیکھ کر گھبرا گئی
تھی، مگر لالہ جی کے ہونٹوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ دیکھ کر ہنس دی
لالہ جی بولے: "میں سمجھا بھڑ ہے۔ ٹخنوں میں جا گرا تھا کلیجہ۔"
"بڑی کھلی سڑکیں ہیں آپ کے جسم میں"، کسم نے فقرہ کسا۔

لالہ جی کوئی مناسب جواب نہ پاکر یوں بولے جیسے حلق میں چبھی ہوئی سوئیاں نکال رہے ہیں "بات یہ ہے کسم کہ میں دو مہینے سے ایک پیٹنٹ دوا استعمال کر رہا ہوں۔ اسی لئے تو سبزی کے سوا کچھ کھاتا نہیں۔ پرہیز ضروری ہے اور پھر یہ تو تم جانتی ہو کہ پرہیز کمزور کر دیتا ہے۔"

اچانک حویلی کے دروازے پر دستک ہوئی، اور لالہ امیر چند دستک کے جواب کا انتظار کئے بغیر اندر گھسے چلے آئے۔ وہ اس سے پہلے بھی یونہی آتے رہتے تھے اور جس روز انھوں نے ننگے پاؤں پھرتی ہوئی کسم کی ایڑیوں پر ہاتھی دانت کی گیندوں کی پھبتی کسی تھی۔ تو کسم نے ان کی آنکھوں میں کئی زبانوں کو تڑپتے دیکھ لیا تھا اسی لئے لالہ امیر چند اُسے اچھے نہیں لگتے تھے۔ آج جب انھوں نے دیکھا کہ کرسی کا ٹاٹ زمین پر پڑا ہے۔ لالہ جی کی گردن میں خم اور پیٹھ پر گرد ہے اور کسم کے ہونٹوں پر شرارت کی سطر کھڑی ہے تو وہ ایکدم زور سے ہنسے۔ تالی بجا کر بولے "کشتی ہو رہی ہے تیتی کی؟"

لالہ مراری لال کی مسکراہٹ نے مزید شہ دی۔ اب امیر چند نے کسم کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا "کسم نے پٹخنی دی ہے شاید؟"

—— اور کسم اندر بھاگ گئی۔ ایک کونے میں سمٹ کر پڑ رہی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ جو حقدار ہے وہ پرہیز کی وجہ سے چھوڑ دے تاب نہیں اور جو تماشائی ہے وہ دونوں ہاتھ سے ہڑپ کرنے پر تل جائے۔ لالہ مراری لال اندر آئے۔ کسم کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر گر کے تیوری چڑھا کر دہلیز پر ٹھٹکے ہوئے امیر چند کی آنکھوں میں دے ماری۔ اور کسم سے بولے "آخر ایسا بھی کیا؟"

امیر چند پلٹ گئے۔ تو کسم سسکیاں بھرنے لگی "لالہ امیر چند یہاں نہ آیا کریں —— بس —— ہاں —— ابھی پچھلے دنوں مجھ پر پھبتی کسی تھی

آج آکر لیٹ لے ڈالے میری لجا کے ــــــ دوست میں تو پڑ جاؤں گی ــــ ہاں!"

اور لالہ مراری لال چپکے سے باہر کھسک آئے۔ امیر چند سے کھسر پھسر کی۔ اُس کے شانے کو تھپتھپایا، ہاتھ جوڑ لے۔ اور اس کے بعد لالہ امیر چند اندر کبھی نہ آئے۔ بس باہر ہی سے پکار دیتے "مراری جلدی آکے پر چلیں؟" اور پھر ایک دو بار یوں کھانستے جیسے حلق سے چمٹے ہوئے تنکے کو اچھینٹا چاہتے ہیں۔

کسم اکثر سوچتی کہ اگر لالہ مراری لال کو محض کسی بھوجن تیار کرنے والی کی ضرورت تھی۔ تو ان گنت نوکرانیاں مل سکتی ہیں۔ آخر کسم کو بندھن میں جکڑ کر اس سے محض روٹی پکوانے کا کام لینا تو سفاکی ہے۔ شادی بیاہ کے بعد کی باتوں پر اسے کافی عبور حاصل تھا۔ کیونکہ اس کی سبھی سکھیاں اس کے سامنے ہی بیاہی گئی تھیں۔ اور پھر انھوں نے کسم کو بتایا تھا کہ کنوار پنے کی جوانی تو تالاب کے پانی پر کائی کی حیثیت رکھتی ہے کنول تو جا کر کھلتے ہیں پتی کے گھر میں۔ وہ کنول جو کبھی نہیں مرجھاتے ـــــ یہاں کسم بڑے بڑے کنولوں کی امیدیں لے کر آئی تھی مگر جب اس نے دیکھا کہ تالاب کا پانی ہی سوکھ چکا ہے۔ موئے کنول کہاں اگیں گے۔ تو اُسے ہر طرف تھوہر کے ظالم کانٹوں کا احساس ہونے لگا۔ ان کانٹوں سے بچ کر نکل جانے کی اس نے کئی ترکیبیں سوچیں۔ رامائن کو رٹ ڈالا۔ چند بوڑھی پڑوسنوں سے ہمالیہ کی چوٹیوں پر بسنے والے بیراگیوں کی کہانیاں سنیں جنھوں نے جوانیوں کو بچ کر برف سے آگ سلگائی۔ اور آگ سے امرت نکالا۔ لالہ امیر چند کی بیٹی ہیم لتا سے تو اس کا بہناپا سا

ہو گیا۔ اور جب اُس نے یہ سُنا کہ ہیم لتا کی ماں کب کی سرگباش ہو چکی ہے تو اس کے دل میں لالہ امیر چند سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

"لتا! عمر کیا ہے تمہارے پتا کی؟" ایک دن پوچھ بیٹھی۔

لتا کچھ سوچ کر بولی۔ "دکھوں نے بوڑھا کر دیا ہے، ورنہ عمر تو یہی کوئی بیالیس چوالیس کے لگ بھگ ہو گی۔"

کسم بولی۔ "عمر تو کچھ زیادہ نہیں۔"

اور طوطا پنجرے کی ایک سلاخ کو چونچ سے کھرچ کر بولا۔ "وار رے بنارے۔ وار رے بنارے۔"

لتا ہنس پڑی۔ اور کسم آنکھیں جھپکانے لگی۔

لالہ مراری لال کچھ اداس اداس رہنے لگے، کیونکہ لالہ امیر چند اب واک پر نہیں جاتے تھے اور اکیلے واک پر جانا تو کچھ ایسا ہے، جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں رانا چتے پھرنا۔ پچھلے چند دنوں سے لالہ امیر چند کو روحانی تھکن کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ اور چونکہ لالہ مراری لال کو اس مرض کا خاصہ تجربہ تھا اور وہ خود ایک برس سے پیٹنٹ دوائیں استعمال کر رہے تھے اس لئے کئی مفید مشورے دیے اور کہا۔ "ایک بار استعمال کرو اور پھر دیکھو۔ کیسے اینٹھن سی ہوتی ہے رگوں میں۔ پر ہاں زیادہ خوراک نہ لینا۔ رات کو نیند نہیں آئے گی۔ بوتل پر سب ہدایات لکھی ہوئی ہیں، کہو تو لیتا آؤں؟"

اور لالہ امیر چند جواب دیتے۔ "دیکھیں گے۔ ابھی تو میں آسانند وید کی ایک دوا استعمال کر رہا ہوں، جو بندھیاچل کی جڑی بوٹیوں کے ست سے تیار ہوئی ہے۔" لالہ مراری لال کو واک پر جانے کیلئے ایک ساتھی کی ضرورت تھی اور وہ انہیں لالہ امیر چند کے بوڑھے بہنوئی کی صورت

میں مل گیا۔ اُن کا نام اوی ناش تھا۔ وہ ایک عرصے سے ہردوار میں مقیم تھے۔ ان کا اصلی نام رام دیا تھا۔ مگر ہردوار والوں نے کہا کہ اس نام میں پنجابیت ہے۔ اس لئے اسے بدل دینا چاہیئے۔ وہ یہاں تین مہینے کی چھٹی پر آئے تھے۔ چھٹی لیکر پہاڑوں پر جانا تو ناممکن ہو گیا تھا۔ اس لئے انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ جب چھٹی کا مقصد اچھی صحت حاصل کرنا ہے اور یہ صحت پہاڑوں کی پاکیزہ ہواؤں کے علاوہ مفت کی پر تکلف دعوتوں میں بھی مل سکتی ہے تو اتنے اصراف سے فائدہ! ہواؤں سے پھیپھڑے بھرے جاتے ہیں، دعوتوں سے تو ندیں بھی ٹھونسی جاتی ہیں۔ اور پیٹ بہر حال پھیپھڑوں سے زیادہ توجہ کے لائق ہیں۔ وہ بلا کے چٹورے واقع ہوئے تھے ہیم لتا بے چاری ہر وقت رسوئی میں پڑی رہتی اور بھوبھا کی خاطر مدارات میں کوئی فرق نہ آنے دیتی۔ اوّل تو اسے خود بھی پھوپھا سے اُنس تھا۔ کیونکہ وہ اس کے لئے ہردوار سے قسم قسم کے تحفے لائے تھے۔ دوسرے لالہ امیر چند کی سخت تاکید تھی۔ کہ ہیم لتا کہیں باہر نہ جائے، حتیٰ کہ کسم کے ہاں بھی کم جائے مبادا لالہ اوی ناش بے توجہی کا گلہ کر بیٹھیں۔ اور ناک کٹ کر وہ جا گرے!

لالہ مراری لال دفتر سے آتے۔ کسم سے دو چار باتیں کرتے اور پھر اوی ناش کو ہمراہ لے کر ڈاک پر نکل جاتے۔ لالہ امیر چند نے دکان کو اپنے نائب کے حوالے کر دیا تھا سارا دن گھاٹ پر پڑے رہتے۔ پانچ بجے کے بعد چھت پر چلے جاتے، اور دیر تک، وہاں ٹہلتے رہتے، ہیم لتا نیچے رسوئی میں شام کا کھانا تیار کرتی رہتی۔ اندھیری شاموں کو جب لالہ جی چھت سے اُترتے تو اگرچہ اُن کے مزاج کی تھکن بدستور ہوتی، مگر ان کے چہرے میں

سرخی سی ضرور جھلکتی جسے ہیم لتا نے بلندی کی صاف ہوا کا اثر سمجھا تھا اور دوپہر سے ہی پتاجی سے جھگڑا شروع کر دیتی تھی۔ "آپ چھت پر چلیے نا۔ جب تک دھوپ ہے برساتی میں پلنگ پر پڑے رہیے۔ اس کے بعد ٹہلیے۔ پتاجی آپ چھت پر جاتے تو ہیں۔ پر وہاں پلنگ پر پڑے رہتے ہیں شاید۔ مجھے آپ کے قدموں کی چاپ تو سنائی نہیں دیتی، چھت کی ہوا نے آپ کی صحت پر بڑا اچھا اثر ڈالا ہے۔"

لالہ ادی ناتھ اور مراری لال ڈاک سے واپس آتے، تو دیر تک گپیں ہانکی جاتیں، اور پھر لالہ مراری لال گھر جاتے ہوئے امیر چند کو نئی نئی دواؤں کے نام بتاتے۔ گھر آ کر وہ ایک چکر میں پڑ جاتے، انہیں کسم کی چہلیں پسند تو تھیں۔ مگر یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کہ آخر چہلوں کا یہ طوفان ایک دم سے کیسے اُبل پڑا۔ اب نہ وہ لالہ جی کے بوٹ اتارتی۔ نہ اُن سے کوئی مذاق کرتی۔ نہ اُن کی پنڈلیوں کے بال کھینچتی۔ اپنے پلنگ پر پڑی گنگناتی رہتی "سکھی پی کا ملن کیسے ہوئی ری!"

اور جب وہ یہ بول گاتی:۔

چوڑیاں پھوڑ دوں ـــــ مانگ بکھیر دوں
گجرا اُتار دوں دھوئی ری!
سکھی پی کا ملن کیسے ہوئی ری!

تو لالہ جی پکار اُٹھتے "کسم"
کسم محض گردن موڑ کر پوچھتی۔ "جی، جی؟"
"ایسے بھجن نہ گایا کرو۔"
"یہ بھجن نہیں گیت ہے۔"

"ایسے گیت نہ گایا کرو!"

"کیوں جی؟"

"جو بول بار بار منہ سے نکلیں وہ پورے ہو کے رہتے ہیں!"

اور کسم زور زور سے ہنستی "آپ عجیب بھولی باتیں کرتے ہیں، آپ تو بالکل بچے ہیں!"

لالہ جی کی گھبراہٹ اور حیرت دیکھ کر وہ انگڑائی لے کر اٹھتی۔ پاؤں لٹکا کر دیر تک ٹانگیں ہلاتی رہتی۔ سلیپر پہن کر سہج سہج قدم اٹھاتی اور کافی دیر کے بعد لالہ جی کے سامنے ایک تھال آتا۔

لالہ جی سوچتے اور کھاتے اور کھاتے اور سوچتے۔ اور چونکہ ویدوں کے قول کے مطابق کھاتے ہوئے سوچا جائے تو کھانا ہضم نہیں ہوتا اس لئے لالہ جی کا معدہ بھاری رہنے لگا اور اس کا ایک ہی علاج تجویز ہوا — واکیں اور لمبی کر دی گئیں!

اوی ناشی نے نہایت تندہی سے لالہ مراری لال کا ساتھ دیا۔ اتنی لمبی واکیں ہوئیں کہ موٹروں والے بھی ہار جائیں۔ لالہ امیر چند چھت پر ٹہلتے رہتے ہیم لتا کو رسوئی نے باندھ رکھا تھا۔ وہ بے چاری کبھی دن ڈھلے کسم کے ہاں چلی جاتی۔ دونوں طوطے کو چھیڑتیں۔ لالہ اوی ناشی کی ننھی سی توند پر نئی نئی پھبتیاں سوچی جاتیں۔ لالہ امیر چند کے عجیب و غریب مرض کے متعلق فکر کا اظہار کیا جاتا اور ہیم لتا کہتی — "کسم یہ سچ کہتا ہے تیرا طوطا۔ تیرے تو وارے نیارے ہیں، تو جس ڈھنگ سے جیون بتا رہی ہے وہ میرے بھاگ میں ہو تو بھگوان جو کہے کرنے پر تیار ہوں، تو دن بھر آرام سے کھاٹ پر پڑی رہتی ہے، لالہ جی کس کے لئے

دو چار پھلکے تیار کر لیے گر ہبنری بھون کے رکھ لی اور بس!
مجھے دیکھو رسوئی میں بڑی بڑی ہوں۔ اُدھر پتاجی کی جنتا کھائے جا رہی ہے۔
جانے کیا ہو گیا ہے انہیں گھر سے نکلتے ہیں تو کہتی ہوں "ہے ایشور! انہیں
کسی تانگے موٹر کی جھپیٹ سے بچائیو۔" پہلے چھت پر جاتے تھے۔ اب باہر
گلیوں میں بھی گھومتے رہتے ہیں۔ آخر بچارے کیا کریں۔ ڈاک کی پرانی
عادت ہے نا۔"

اور جب لالہ اوی ناش کی تین مہینے کی چھٹی ختم ہو گئی۔ اور وہ ہر
دوار چلے گئے، تو لالہ مراری لال نے لالہ امیر چند سے کہا "ار بھی ار ہنے
بھی دو، میں تو کہتا ہوں تم جوانی میں بھی ایسے لال سرخ نہ ہو گے جتنے
آج کل ہو، یہ کیا ڈھونگ رچا رکھا ہے تم نے چلو میرے ساتھ ڈاک کریں
گے، تو اور نکھرے گی تمہاری صحت" ۔۔۔ بڑی ردو کد کے بعد لالہ امیر
چند رضامند ہو گئے۔ اور اب پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب وہ
دروازے تک آکر پکارتے "چلو ڈاک پر چلیں مراری!" ۔۔۔ تو کبھی
کبھی لالہ مراری لال کسُم سے پوچھتے "کسم ضد کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے
لالہ امیر چند میرے اتنے اچھے متر ہوں اور یوں باہر سے صدائیں لگاتے
پھریں۔ کوئی دیکھے تو کیا کہے۔ کیا حرج ہے اگر وہ آجایا کریں اندر۔"
"نہیں جی!" کسم کہتی۔
"کیوں؟"
"بس"
"آخر کوئی وجہ؟"
"بس۔ ہم نہیں چاہتے ۔۔۔ ہاں!" اور پھر نچلا ہونٹ اُبھر آتا

لٹکا کر کہتی "ہماری مرضی"!

یہ بہار کے آغاز کی بات ہے، لالہ اوی ناتش کو مر دوار گئے کوئی سات آٹھ مہینے گذرے ہونگے، لالہ مراری لال کی زندگی اُسی محور پر گھوم رہی تھی کہ ایک روز اچانک روڑا اٹک گیا۔ لالہ مراری لال ایک بوڑھی پڑوسن کی زبانی یہ سُن کر بھونچکا سے رہ گئے۔ کہ کسم کی گود ہری ہونے والی ہے!

بہار کی ابتدا کیسے پھٹے بچے کھچے ارمانوں میں بھی ایک اضطراب سا بھر دیتی ہے اور پھر لالہ مراری لال تو ایک مدّت سے طاقت کی دوائیں استعمال کر رہے تھے۔ وہ منتظر تھے۔ کہ بہار حسب شباب پر آ گئی، تو پتنی کے تمام حقوق کی نگرانی شروع کر دینگے، مگر اب تو معاملہ ہی دگرگوں ہو گیا تھا۔ شادی کے بعد کا سوال نئے نئے رنگوں میں اُن کے سامنے آیا، مگر یہ ہمیشہ کی طرح ہموار تھا۔ کہیں کہیں کسم کے غیر معمولی ناز اور غمزے اس خط مستقیم میں منحنی سی دھڑکنیں پیدا کر دیتے تھے۔ ورنہ کوئی فکر کی بات نہ تھی، وہ سوچنے لگے، کہ اگر پتنی کو محض چھو لینے سے اُس کی گود ہری ہو جاتی ہے۔ تو جنگ کے زمانے میں جرمنی اور اٹلی کی دواؤں پر اتنے اصراف کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کسم کے بارے میں گھنٹوں سوچتے رہے، اُس روز کسم کو بڑے غور سے دیکھا۔ مگر اس کے چہرے پر خوف و ہراس یا ندامت کا ہلکا سا عکس بھی نہ تھا۔ وہ سوچتے کہ شاید بھولے سے ——— کبھی کسی بھیگی رات کے سناٹے میں ——— ! مگر یہ ناممکن تھا۔ اُنہیں اپنی یادداشت پر ناز تھا۔ ہیڈ کلرک بننے میں اُن کی زبردست یادداشت کا بھی بہت کچھ دخل تھا۔ اور پھر اس نوع کے واقعات تو اُن کے ذہن میں پوری جزوی تفصیلات کے ساتھ بسے تھے کیونکہ آخر مستقبل کی تاریخ انہیں واقعات سے تو مرتب ہوا کرتی ہے

چند روز کے بعد دفتر میں اُن کی میز پر فائلوں کا ایک انبار سا لگ گیا۔ ماتھے کی ہڈی ہر وقت تپتی ہوئی ٹھیکری سی بنی رہتی، ضروری کاغذات پر قلم کی بجائے پنسل سے دستخط کر بیٹھتے، اور پھر بگڑ کر اُسے ربڑ سے مٹاتے تو کاغذ پھٹ جاتا۔ چٹھی کو نئے سرے سے ٹائپ کرانے کیلئے کلرک کو بلاتے اور کہتے "ذرا کھلا کھلا ٹائپ کرو۔ کاغذ ضائع ہوتا ہے تو ہونے دو۔ ہمیں کسی کی پرواہ نہیں!"

وہ جانتے تھے کہ شادی کے بعد بچے پیدا ہوتے ہی ہیں۔ شادی اکثر اسی غرض سے کی جاتی ہے۔ بچے کی پیدائش بیاہے جوڑے کی سب سے بڑی کامیابی اور مسرت ہے لیکن محلِ نظر تو یہ بات تھی۔ کہ لالہ مراری لال کے پرہیز کی مدت ابھی ختم ہی نہیں ہوئی تھی اور بچہ آپ ہی آپ آنکلا! اندیشوں کا ایک طوفان تھا۔ جو اُن کے دماغ میں نت نئے دھاگے پیدا کرتا۔ کئی بار تو وہ اس حد تک سوچتے کہ بچے کو مار دینے کی تجویز پر غور کرنے لگتے۔ مگر پھر جی میں کہتے۔ شبہے کی تو گنجائش ہی نہیں، شادی کے بعد ایسا ہوتا ہی ہے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں، یہ سوا سال بھی ذرا لمبی مدت ہے۔ اس سے پہلے ہو جانا چاہئے تھا یہ واقعہ ——— مگر واقعہ تھا بڑا ٹیڑھا۔ وہ قسم یا کم از کم امیر چند سے اپنی اس فکر کا ذکر کرنے کیلئے بیقرار ہو جاتے۔ لیکن قسم سے بات کرتے جھجکتے، مبادا وہ شور مچا دے، اور اچھا بھلا بچہ پرایا ہو کر رہ جائے؟ جوانی میں اُنہوں نے جو کوک شاستر پڑھا تھا۔ وہ یہی کہتا تھا کہ عورت سے سوچ سمجھ کر بات کرو، ورنہ وہ بگڑ گئی تو سنبھالے نہ سنبھلے گی ——— لالہ امیر چند سے اس کا ذکر اس لئے نہ کرتے کہ وہ فوراً ایک عظیم الشان فیسٹ کا مطالبہ کرینگے ——— اُن کیلئے تعجب کا تو کوئی موقع ہی نہ تھا!

اور پھر ایک روز کسی بے تار برقی کے ذریعے کسم کی ماتا انکلیں اور پڑوسنوں کا تانتا بندھ گیا۔ "آپ آج چھٹی لے لیجئے" کسم کی ماتا نے کسی مصلحت کی وجہ سے کہا تھا۔ اور وہ سوچنے لگے تھے۔ "آخر میں کسی کا نوکر تھوڑا ہوں کسم نے مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ سارا معاملہ خود بخود نمٹا دئے جاتی ہے۔ اگر ایسی ہی غیریت ہے تو مجھے کیا پروا۔ میں دفتر جاؤں گا" ــــ اور وہ ٹھیک دفتر چلے گئے۔

مگر ابھی چار بجنے میں سے نو منٹ رہتے تھے کہ ان کے کمرے کے باہر ایک شور سا بلند ہوا اور پھر لالہ امیر چند کی آواز آئی "نکلو بھئی دفتر سے سامنے آؤ۔ اور فلیٹ کی رقم سیدھے ہاتھ سے رکھ دو!"

ان کے احباب کا انبوہ کمرے میں گھس آیا۔ کلرکوں کی نظریں مسکراہٹیں کھڑکیوں کے شیشوں کے باہر چمٹی ہوئی تھیں۔ اور سارے دفتر میں ایک گونج سی چکر کاٹ رہی تھی۔

لالہ امیر چند آگے بڑھ کر بولے "اچھا تو آپ اپنے کارنامے چھپائے رکھتے ہیں ہم سے!"

لالہ مراری لال نے سوچا جو ہونا تھا، ہو چکا۔ اب جی برا کرنے سے فائدہ! سنبھل کر بات کرو۔ مسکراؤ۔ یہ بھگوان کی دین ہے۔ قبول کر و اسے۔ شاباش!

ضمیر کی چٹکیوں سے مجبور ہو کر انہوں نے کہا "ایسی باتوں کے اشتہار تو لگائے نہیں جاتے!"

لالہ امیر چند بولے "اچھا تو فلیٹ کی بات کرو!"

لالہ مراری لال نے مسکرا کر کہا "ہو گی اور دھڑلے سے ہو گی!" ــــ اور

پھر دفتر سے نکل کر انہوں نے گھر کی راہ لی۔ سارے احباب ہمراہ تھے۔ راستے میں لالہ مراری لال نے ایک راز کا انکشاف کیا۔ ”ویسے تو مجھے پہلے بھی کوئی انکار نہ تھا۔ مگر اب تو ہمیں مہنگائی الاؤنس ملا کریگا۔ پچھلے چھ مہینوں کا الاؤنس بھی اب کے اکٹھا مل جائے گا! فکر کی بات نہیں۔“

حویلی کے دروازے پر لالہ امیر چند بولے۔ ”سُنا ہے بھابی بچے کا نام خود ہی چُنے گی کسی پنڈت ونڈت کی ضرورت ہی نہیں۔ سمجھی، سُنا ہے کبیر چند نام ہوگا ہمارے بھتیجے کا، مگر مراری۔ یہ کبیر تو کوئی عربی لفظ معلوم ہوتا ہے“ کواڑ کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے ایک لالہ جی بھوری مونچھوں میں سے بولے۔ ”تو بھائی یہ امیر ہماری بھاشا ہی کا لفظ ہوگا۔ ہے نا۔ یہ بھی تو مسلمانوں ہی کی گھڑنت ہے!“

اور لالہ مراری لال سوچنے لگے۔ آخر بچے کا نام گردھاری لال یا سردار لال کیوں نہ ہو، گردھاری یا سرداری یا مراری ——— اور یہ کبیر اور ——— انھوں نے گھبرا کر سامنے دیکھا۔ اور اچانک اندر سے طوطا پکارا۔ ”وارے نیارے۔ وارے نیارے!“
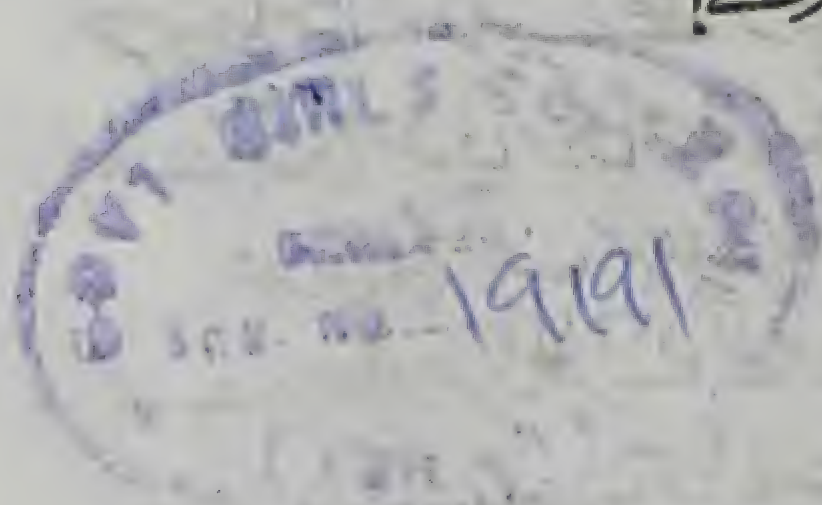
سانولا

چوڑے چکلے صاف پتھروں پر دائرہ بنا کر بیٹھے ہوئے دہقان حقے کا انتظار کر رہے تھے اور احمد بیگ کے دیو پیکر کی اچانک موت کا موضوع ختم ہو چکا تھا۔ جعفر میرے گھٹنے کو تھپتھپا کر ہولے سے بولا۔ "اب لطف آئیگا ہمارے بھائی حقہ پی کر ہی موج میں آتے ہیں"۔

اور بیچ بیچ خیب سرحدی حقے سے نکلے ہوئے گاڑھے دھوئیں کے بور بنے اِدھر اُدھر لڑکھڑانے لگے تو دہقانوں نے بیٹرے بدلے بسبب کے چہروں پر ایک عجیب سی لذت آمیز بے چینی پھیل گئی۔ جیسے منتظر ہیں۔ اور انتظار سوہان روح ہے۔

ایک بولا۔ "بھئی تمباکو میں پانی کم ٹپکایا کرو پھسپھسا ہو جاتا ہے دھوئیں میں جان نہیں رہتی"۔

دوسرے نے پلٹ کر دیوار پر تھوکتے ہوئے کہا: "ابکائیاں آنے لگیں ہیں"
تیسرا اپنی بھاری لٹھ کا زاویہ بدل کر بولا: "واہ سوکھا تمبا کو بھی کیا جیسے کوئی بے گھی کی دال کھائے۔"

"سانولے کی طرح" جعفر نے کہا۔ اور پھر میرے کان میں بولا: "اب دیکھنا"
"بالکل" ایک بوڑھا تنکے سے ایک مکوڑے کو چھیڑنے لگا۔ "بالکل سانولے کی طرح، مجھے بھی بے گھی کی دال یاد آئے تو ساتھ ہی سانولا بھی یاد آجاتا ہے"
"سانولا؟" میں نے کہا: "بھئی خوب نام ہے"
جعفر کے والد تکیے کو کہنی کے نیچے سے نکال کر بغل میں جماتے ہوئے بولے: "کام دیکھو سانولے کے تو نام بھول جاؤ۔ جعفر تم نے ابھی تک اپنے دوست کو سانولے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ان دو تین دنوں میں ہمارے گاؤں میں سانولا ہی تو دیکھنے کی چیز۔ ڈپٹی صاحب تصویر اتار کر لے گئے تھے۔ کہتے تھے لندن کے اخبار میں چھپے گی۔ انعام ملیگا۔"
"کیسے؟" ایک آواز آئی۔
"ڈپٹی صاحب کو۔ اور کسے؟" جعفر کے والد صاحب کا تکیہ بغل سے نکل کر گھٹنے تلے آرہا تھا۔
"ایک کتا خرید لیا ہوگا۔ انعام لے کر" جعفر ہندوستان کی انقلابی تحریک سے بہت متاثر تھا۔ اس لئے کبھی کبھی جوش میں آکر ان دہقانوں سے سیاسیات کی انگریزی اصطلاحوں میں بھی باتیں کرنے لگتا تھا۔ اب بھی وہ سنبھل بیٹھا۔ جیسے ہوا میں کسی پر جھپٹنے والا ہے۔ "کتا، یا کتاب، یا کموڈ"۔
"کموڈ کیا ہوتا ہے؟" ادھر سے ایک پتھر پر بکھرے ہوئے بزرگ پکارے "بھئی جعفر ساتھ ساتھ بتا بھی دیا کرو نا۔"

"یہ ایک قسم کی ـــــ" جعفر کموڈ کی تفصیلات میں جانے لگا تھا. میں نے ٹھوکا مار کر اسے روکا. وہ بولا "یہ ایک قسم کی کرسی ہوتی ہے. بیٹھتے ہیں اس پر."

"آج ہی سنا ہے یہ کرسی کا نیا نام". وہ بزرگ ہونٹوں پر پھڑپھڑاتی ہوئی مسکراہٹ لئے پھر پتھر پر بیٹھ گئے.

جعفر کے والد کا تکیہ گھٹنے سے نکل کر گھٹنوں میں آ گیا تھا. وہ شاید کموڈ کا مطلب سمجھ گئے تھے کیونکہ ان کی گھنی مونچھوں کے پیچھے ایک دبی دبی طنز ہونٹوں کی لرزش میں ہاتھ پیر مار رہی تھی. ہنسی کو کھانسی میں بدل کر بولے "بڑے شریر ہوتے ہیں یہ پڑھے لکھے. بات کا بتنگڑ اور بتنگڑ کی بات بنانا چاہو تو ان سے سیکھو. بینڈکیاں چیرتے رہے ہیں اسکولوں میں، جن دنوں جعفر کی ماں، خدا بخشے، بیمار تھی، تو ایک رات اس کی پسلیوں میں بڑا سخت درد اٹھا. جعفر میاں نے کئی اوٹ پٹانگ باتیں بنائیں پسلیوں کے بارے میں. میں نے پوچھا تم کیا جانو اندر کا حال. بولا. ہم نے بینڈک چیرے ہیں. بینڈک اور انسان کی قسم ایک ہے."

دہقان بغلیں جھانکنے لگے اور پھر ایک ساتھ قہقہے لگانے لگے.

جعفر کھسیانہ ہو کر بولا "بھئی تم نہ سمجھو تو کیا کروں. یہاں کوئی لیبارٹری ہوتی تو ـــــ" "یہ لاٹری بھی کسی کرسی کا نام ہو گا" پھر بزرگ بولے اور جعفر بھنا گیا "جی ہاں یہ بھی کرسی ہی کا نام ہے جس پر تمہاری ـــــ"

میں نے اُسے روک لیا. جعفر کے والد اٹھ بیٹھے "ارے میاں رحم کرتے اور نیا بھی کرو بیوقوف". اور جعفر مجھے ہاتھ سے کھینچ کر مجمع میں سے اٹھا لایا.

میں نے جعفر کو مستقل مزاجی اور حوصلہ مندی کی نصیحت کرنا

چاہئے، مگر وہ بولا: "جانتا ہوں بھئی، جانتا ہوں۔ تم تو ہوئے دہلی والے۔ یہیں پیدا ہوا۔ یہیں رہا۔ جانتا ہوں سب کو۔ مذاق کرتا بھی ہوں سہتا بھی ہوں۔ البتہ یہ بوڑھا جو پھیلا ہوا تھا پتھر پر۔ اس کا ٹینٹوا دباؤں گا کبھی۔ جوالنوں کی طرح بات بات پر پھبتی کسنے کا شوق ہے بدبخت کو۔ لونڈے کے ہیں اس کے تو سب فوج میں ہیں۔ اور خود سوال ہے۔ وہ بھی فوجی ہی معلوم ہوتا ہے

وہ کہاں ہے؟"

"اس کی بیوی کے پیٹ میں!"

"فوجی کیسے ہوا؟"

"بوڑھے میاں ابھی سے اُس کے لئے نقلی بندوق، ہوائی جہاز اور ٹینک جمع کرتے پھرتے ہیں۔ پرسوں جیب میں ایک مشین گن ڈال رکھی تھی ——— سو ذرا بھی چھوٹا پیمانہ ہے بچوں کے کھلونے ہوتے ہیں ——— جھنجنے یا بنگنگ بالٹھ ——— ارے ہاں۔ وہ سانولے کا نام سنا تھا تم نے؟ میں بے چین ہو گیا۔ "یہ بھی اُس کے بارے میں کچھ بتانا۔ خدا کے لئے ——— تمہارے والد نے تو یوں بات کی تھی۔ جیسے میں نے سانولے کو نہ دیکھا تو کچھ نہ دیکھا!"

جعفر مجھے اپنی بیٹھک میں لے گیا اور بتایا، کہ اسکے والد نے بالکل ٹھیک کہا تھا ——— تو مجھے تیجی لٹو سے یاد آیا ——— بالکل بوڑھا ہے وہ مڈیوں کا ڈھانچہ۔ سر گنجا۔ کناروں پر اکا دکا سفید بالوں کی جھالر۔ جب دیکھو جب ہی لٹو گھماتا نظر آئے گا۔ کوئی لٹو چرا لے اسکا۔ تو وہ گالیاں تولتا ہے کہ شیطان پناہ مانگے۔ اِدھر لٹو چلاتا ہے۔ اُدھر لوری گاتا ہے ——— سو جا رے ننھے ——— سو جا رے بگلے ——— رات ہوئی اندھیاری، اور ———

— میّا کو بھول بھی۔ منڈوے میں بھول بھی — میّا گئی بے چاری۔"

اس کے بعد جعفر نے مجھے سانولے کی ساری کہانی سنائی۔ وہ اس گاؤں کا ایک عام قسم کا دہقان تھا اور چونکہ عام قسم کا تھا اس لیے اس خاص بات کی توفیق نہ تھی جو انسانی زندگی کی کہانی کا نقطۂ عروج سمجھی جاتی ہے۔ شادی کے لیے اول تو رقم چاہیے تھی اور دوسرے شخصیت۔ لیکن اس کے باپ کی طویل علالت اور پھر موت نے رقم نہ جمع ہونے دی اور اسطرح غریبی نے شخصیت پر خاک ڈال دی۔ اتنا بڑا اگر انڈیل جوان برسوں ایک بیوی کی تلاش میں بھٹکتا پھرا۔ لیکن بیچارے نے ہر جگہ منہ کی کھائی۔ گاؤں میں یہ خیال عام تھا کہ سانولے کا باپ سکندر آباد سے حرامی کی کالی کلوٹی عورت بیاہ لایا تھا۔ اور جس کے لیے اس نے دالان کے اردگرد چار دیواری کھڑی کر دی تھی، نسلاً چمارن تھی۔ اس لیے اب کون اپنی لڑکی کو چمارن کے بیٹے کے پلّے باندھتا۔ سانولے نے ایک دفعہ سکندر آباد جا کر اپنی ماں کے خاندان کا پتہ لگانے کا ارادہ بھی کیا، لیکن اتنے لمبے سفر کو بے سود سمجھ کر اُس نے علاقے کے دور دراز دیہات میں کوشش شروع کی۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک فصل کی کٹائی کے بعد کہیں پردیس چلا گیا اور مدت تک واپس نہ آیا۔ اسکے مکان کے دالان میں جگہ جگہ گھاس اُگ آئی۔ دروازے پر مکڑیوں کے جالے ڈھنگ سے جالے تن گئے۔ منڈیر پر اوندھی پڑی ہوئی سیاہ بجھنگ ہانڈی کسی شریر بچے کے غلیل سے اُڑ گئی۔ ایک مرتبہ گاؤں کے چند نوجوانوں نے ایک جوڑے کو سانولے کے چھپر تلے سے پکڑ لیا۔ لیکن عورت نے اُن حملہ آوروں سے کئی چکنے چپڑے وعدے کیے۔ مرد نے سرمایہ بانٹنے کا عہد کیا۔ چھپر مرکز نقل منفر ہوا۔

اور ان دونوں کو چھٹی مل گئی۔

مگر ایسی باتیں تو شاہی محلوں میں نہ سما سکیں۔ یہ تو بے چارے بن بلسی سانولے کا برانا چھپر تھا۔ جس میں بارش کے طرار جھالوں نے جگہ جگہ جھول ڈال دی تھی۔ سارے گاؤں میں اس سودے کے چرچے ہونے لگے۔ جو لوگ رات کے حملہ آوروں میں شامل نہ تھے۔ وہ دوسری رات کو شام ڈھلتے ہی ہولے ہولے قدم اٹھاتے سانولے کے مکان کے پاس آئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دالان میں پیلی پیلی روشنی اونگھ رہی ہے جھینگر بلا رہے ہیں جیسے انہیں نو واردوں کے اس جارحانہ حملے سے نفرت ہے کھسر پھسر کی آواز بھی آرہی ہے اور ساتھ ہی کبھی کبھی کڑے کڑا اور چوڑیوں سے چوڑیاں بھی بج اٹھتی ہیں۔

اس ماحول میں صبر سے کام لینا دشوار ہوگیا۔ اصل میں جذبۂ غیرت کی بجائے ان لوگوں کے ذہنوں میں جذبۂ حسد ہلچل مچا رہا تھا۔ رکے ہوئے سیلاب کی طرح گڑگڑاتے ہوئے دالان میں آگئے اور دیئے کی روشنی میں بیٹھے ہوئے جوڑے پر جھپٹنے ہی والے تھے کہ کھاٹ سے سانولا اترا۔ اور ان کے قریب آکر بولا: "اصل میں چپ چاپ آنے میں بڑا مزہ ہے میں نے کہا یوں گھر بیٹھے ہو کہ صبح کو جب میرے گاؤں والے مجھے ہنسی اپنی بیوی کے ساتھ کھیتوں پر جاتے دیکھیں، تو حیران رہ جائیں۔ کس نے بنایا نہیں"؟

سب کے سب بغلیں جھانکنے لگے چوکیدار کی لٹھ جو زاویۂ قائمہ کی صورت میں زمین پر گڑی ہوئی تھی۔ زاویہ حادہ بنا کر جھک گئی۔ عقب میں کھڑے ہوئے لوگ کھسک گئے۔ چند نوجوانوں نے سانولے کی

شادی پر رسماً خوشی کا اظہار کیا اور اُسے مبارک باد کہتے جب گلی میں
آئے تو چوکیدار نے سب کے دلوں میں ایک تیر سا گاڑ دیا۔
"کہیں سے بھگا لایا ہے"۔ اُس نے ٹھڈ کو دیوار سے لگا کر کہا۔ "ورنہ
بھئی چمارن کے لڑکے کو داماد کون بنائے گا؟"
"کوئی چمارن ہی ہوگی"۔ ایک دل جلا پکارا۔
اور چوکیدار نے مونچھوں کے انبار کو ہٹا کر ہونٹوں کے نم آلود گوشوں
کو پونچھا۔ "تبھی تو میں نے دیئے کی روشنی میں ایک بار اس کا چہرہ دیکھا
تھا۔ اگر چمارنیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ تو دوزخ میں گئیں شہزادیاں بھی چاند
کی ٹکڑی کیا چیز ہے ــــ مجھے تو کچھ شک پڑتا ہے"۔
بھلا گاؤں کے اتنے بڑے سرکردہ حاکم کے دل میں شک پیدا
ہو اور دوسرے گاؤں والے اس کھد بد سے محروم رہیں! رات کی رات
کھسر پھسر چرچے ہونے لگے۔ ڈومنوں کو پتہ چلا تو ڈھولکیوں کی رسیاں کس
لیں اور پو پھٹتے ہی دھما چوکڑی مچاتی سانولے کے ہاں چلیں۔ ڈھولک
کی آواز دعوت عام ثابت ہوئی۔ چھتوں پر بچھی ہوئی کھاٹوں پر چیتھڑوں
اور گودڑوں میں حرکت ہوئی اور ان کی آن میں سرخ اور نیلے لٹھے کی
اوڑھنیوں کا ایک سیلاب سا اُمڈ پڑا۔
سانولا پہلے ہی کسی وجہ سے اداس بیٹھا تھا۔ یہ آوازیں سنیں تو
اور سٹپٹایا نئی بیوی ڈھولک کی ٹھیں ٹھیں ٹھنکر اندر کوٹھے میں چھپ
بیٹھی۔ سانولے نے وضو کرنے کے بہانے سے کوزہ اٹھایا۔ تو دروازے
سے ڈومنوں کی سردار بولی۔ "بچھڑ نہالینا میاں"۔
قہقہوں کا فوارہ سا چھوٹ پڑا۔ انبوہ کی آخری قطار نے پوچھا۔ کیا

بات ہے؟"

ادھر سے جواب ملا۔ "سو رہے تھے۔"

قہقہوں کا ایک اور فوارہ چھوٹا۔ اور انبوہ کے نقطۂ آغاز پر کھڑی ہوئی ڈومنی بغیر کسی وجہ کے یخ یخ ہنس پڑی اور اپنی ہمجولیوں کو کانے کا اشارہ کیا۔ اس چھنچھم دھاڑ میں سنی گاؤں والیاں اندر گھس آئیں۔ نوجوان باہر دیواروں سے لگ کر کھڑے تھے کہ کب سانولا باہر نکلے اور اس سے اس میوے کے بازار کا پتہ پوچھیں۔ مگر جو عورت باہر آئی۔ اسکا منہ لٹک رہا تھا۔ بڑبڑاتی چلی جا رہی تھیں۔

"مجھے تو شک پڑتا ہے۔"

"کنواریوں کے یہ رنگ ڈھنگ! ۔۔۔ میں تو کبھی نہ مانوں۔"

"آنکھیں بولتی ہیں۔"

"ڈوپٹے کو ہٹاتی ہی نہیں ۔۔۔ ہٹا دے تو بھرم کھل جائے۔"

"کیا بھرم کھل جائے؟ کیا راز ہے؟" نوجوان سارسوں کی طرح گردنیں بڑھا بڑھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے؟" ایک نوجوان نے ایک بڑھیا سے پوچھ ہی لیا۔

اور بڑھیا اپنی ناک کو انگشتِ شہادت سے دبا کر غصے بولی۔ "کسی جاگیردار کی نوکرانی اٹھا لایا ہے۔ پڑھی لکھی ہے پردہ کرائیگا۔"

جاگیردار کی نوکرانی! پڑھی لکھی! پردہ! اور چالیس برس کا ایک ان پڑھ دہقان، جسکی ماں چمارن تھی اور جسکے باپ کے پیٹ میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ نوجوانوں کا شوق بڑھا۔ منتظر رہے۔ کہ دو چار دنوں کے بعد سانولے کی بیوی گھر سے پانی لانے نکلے تو دیکھیں۔ مگر سانولا خود

ہی پانی لانے لگا۔

گھڑا اٹھا کر باہر آیا اور کھٹ سے زنجیر چڑھا دی۔ قصبے سے پوٹلیاں سی باندھ کر لایا۔ اور چھپتا چھپاتا دیوار پھاند کر اندر آ۔ کبھی کبھی اُسے گاؤں کی تجربہ کار دائی کے گھر بھی جاتے دیکھا گیا۔ ہر وقت اداس اور کھویا کھویا۔ جیسے کسی نے معدے میں گھونسہ جما دیا ہے۔ کسی نے وجہ پوچھی۔ تو بولا "قسمت"۔ کسی نے دلہن کا حال پوچھا۔ تو ہونٹ چبا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ جیسے پوچھنے والے کی کنپٹی ادھیڑنے کے لئے کسی نکیلے پتھر کی تلاش میں ہے۔

تین مہینے اسی طرح گذر گئے کہ ایک روز گاؤں والے یہ خبر سن کر بھونچکا سے رہ گئے کہ سانولے کی دلہن روٹھ گئی! ——— کیوں روٹھی، کب روٹھی۔ کہاں گئی۔ کیسے گئی؟ گاؤں کی بوڑھی دائی کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا اور وہ ہر شخص کو یہ کہہ کر ٹال دیتی تھی۔ "جانتی ہوں پر بتاؤں گی نہیں۔ قرآن کی قسم کھائی ہے۔"

شک سے بھرپور دلوں میں ایک اور کانٹا کھٹک گیا۔ چوپال پر یہ ذکر آیا تو جعفر کے ابا جان حیران ہو کر بولے۔ "سانولا کہاں ہے؟"

"ہاں ہاں بھئی سانولا کہاں ہے؟" کسی نے تائید کی۔

چوکیدار کو اس کے گھر بھیجا گیا۔ مگر وہ پلٹ کر آیا تو وحشت زدہ سا۔ آنکھیں سرخ۔ ہاتھوں میں کپکپی۔ بولا "سردار۔ وہ تو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ میں نے پوچھا "دلہن کہاں گئی تیری؟" کہنے لگا۔ "ہٹ تیری دلہن کی ———" اور جھپٹا مجھ پر وہ تو خیر گزری کہ اُس کی جھولی سے لٹو گر پڑے ورنہ ——— "

"لٹو گر پڑے"؟ جعفر کے ابا جان نے پوچھا۔ "لٹو کیسے گر پڑے"؟
ہانپتا ہوا چوکیدار بولا "یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا تھا۔ وہ چھپر تلے بیٹھا لٹو گھما رہا تھا۔ اس کی جھولی میں بھی کئی لٹو تھے"!
"لٹو تھے"؟ جعفر کے ابا جان جیسے کسی اندھیرے غار میں گھس کر بھٹک گئے ہیں۔ "دائی کو بلاؤ" ــــ اور پھر اٹھتے ہوئے بولے "میں خود جاتا ہوں۔ آخر معاملہ کیا ہے"!
چوپال والے منتظر بیٹھے رہے اور آخر جب جعفر کے والد واپس آئے تو بولے "سانولے کا دماغ چل گیا ہے"!
"اور دلہن"؟ ایک نوجوان نے بیتاب ہو کر پوچھا۔
جواب ملا "بھئی میں یہ نہیں بتاؤں گا۔ قرآن کی قسم کھائی ہے"!
جعفر نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس نے اپنے والد سے انہیں دنوں سارا راز پوچھ لیا تھا مگر جب میں نے اس سے تقاضا کیا تو بولا "نہیں بھئی رہنے دو۔ مجبوری ہے۔ میں نے قرآن کی قسم کھائی ہے"!
جعفر نے مجھے سانولے کے بارے میں اور بہت سی باتیں سنائیں کہ چند بیگھے زمین بیچارے کی ہے ہی مزارعہ ہر سال کچھ نہ کچھ دے جاتا ہے جس سے سال بھر گزر کر لیتا ہے۔ ہفتے عشرے کے بعد قصبے سے بہت سے لٹو خرید لاتا ہے اور بچوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ لٹو گھمانے میں ایسا طاق ہے کہ گھڑی سامنے رکھ لو لٹو پانچ چھ منٹ تک تو گھماتا رہے گا بچے اس سے خوش ہیں۔ اس لئے اسے بالکل نہیں چھیڑتے۔ اور جو بچہ اس سے بہت مل جلے اس پر تو قربان ہو جاتا ہے۔ اس سے بچوں کی طرح کھیلتا ہے اور تھوڑا بہت کرا اور اسے اپنی گردن پر بٹھا کر گلی گلی

ہتھیلیاں اور گھٹنے چھیلتا پھرتا ہے۔ شام کو چھوکروں کے ہاں سے ایک تندور روٹیاں لاتا ہے اور چنوں کی دال ابال کر نگل لیتا ہے۔ گرمی سردی میں اندر ہی سوتا ہے۔ شام کے بعد اسکے مکان سے اتنے تیز اور وحشت ناک قہقہے بلند ہوتے ہیں کہ اچھے اچھے حوصلہ مند نوجوان کبھی اُسکی گلی میں نہیں پھٹکتے۔ کہتے ہیں آسیب ہے، سایہ ہے، جن سوار ہے۔

"مکان کہاں ہے اس کا؟" میں نے جعفر سے پوچھا۔

جعفر چائے ڈالنے کے لیے اُٹھتے ہوئے بولا۔ "ارے بھئی رہنے بھی دو۔ ابھی کسی وقت وہ گلی سے گذرے گا تو دکھا دونگا تجھے۔"

مگر میں مصر رہا کہ آج رات کو سالو لے کے قہقہے سُن کے ہی رہونگا۔ "ذرا دیکھیں تو سہی، یہ آسیب کیا ہوتا ہے، کیسے شروع ہوتا ہے، کیسی حرکتیں کرتا ہے، کیسے پیچھا چھوڑتا ہے۔ یہ تو ایک تجربہ ہے اور تم ڈاکٹر ہو۔ ایسے کیس ہر جگہ تو ملتے نہیں۔ تمہیں تو مطالعہ کرنا چاہیئے اُسکا۔"

جعفر بولا۔ "من من بھر کی گالیاں سن کر مطالعہ کیا جائے اُس کا۔ اسے ہم محروم ہی بھلے۔ اُس خدا کے بندے کو ذرا ٹکٹکی باندھ کر دیکھو تو وہ بکواس کرتا ہے کہ بیبیاں انگلیاں ڈال لیتی ہیں کانوں میں۔"

مگر میں نے جعفر کو مجبور کر ہی لیا۔ شام ہوتے ہی وعدہ یاد دلایا۔ ہچکچاتا ہوا اٹھا اور باہر آکر بولا۔ "تم سودائی ہو۔"

مغربی دھند میں نیا نیا چاند یوں حیران کھڑا تھا۔ جیسے چیل کا اکیلا پر کیکر کی ٹہنی میں اٹک گیا ہو۔ موہوم سی چاندنی نم آلود تھی۔ روئی روئی سی جیسے شبنم کے چشمے میں نہا کر نکلی ہو۔ گلیاں چپ چاپ ہو گئیں۔ جیسے اُن سے تاریکی نے زندگی چوس لی ہو۔ ہم دونوں ٹیڑھی بنکی گلیوں میں سے

ہوتے ہوئے سانولے کے مکان تک پہونچے۔ یہاں بھی جعفر نے مجھے روکنے کی کوشش کی، مگر اپنے شوق کو تشنہ رکھنے کا میں عادی نہیں۔ آخر سانولے کو کسی مقام سے دیکھنے کی تلاش ہوئی۔ مگر بے سود دروازہ بند تھا اور دالان چار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔

"چھت میں سوراخ ہوگا" میں دیہات کے فن تعمیر کے بارے میں حاصل کی ہوئی نئی نئی معلومات کو بروئے کار لایا۔ "میں نے اس گانوں کی ہر چھت میں سوراخ دیکھا ہے۔"

جعفر نے میری تائید کی۔ ایک چھوٹی دیوار پر چڑھ کر ہم بڑی مشکل سے منڈیر کے سہارے چھت پر آئے۔ سانولے کے دالان میں جھینگروں نے اودھم مچا رکھا تھا اور چھپر تلے کبھی کبھی دو جگنو ٹمٹما جاتے تھے۔ ہم نہایت آہستہ آہستہ کنارے کنارے چلتے چھت کے وسط پہونچے۔ بڑی احتیاط سے آگے سرک کر میں نے چپکے سے ایک ٹوٹا ہوا سرپوش اٹھایا۔ چھت میں ایک بہت کھلا سوراخ تھا۔

"بھئی تمہیں دیکھو" جعفر پیچھے ہٹ کر بولا۔

میں نے نیچے جھانکا۔ دیئے کی روشنی میں ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ بوڑھا ضعیف سانولا ایک کھاٹ پر بت بنا بیٹھا تھا کہ اچانک اس نے اپنا چولا اُتارا۔ تہمد کو اڑس کر لنگوٹی سی بنائی اور پھر اپنے بازوؤں اور رانوں کو زور زور سے تھپتھپایا اور تھپکا کر ادھر ادھر یوں ٹہلنے لگا جیسے کسی کو اپنے جسم کے فولادی پن اور اپنے پٹھوں کی سختی کا یقین دلانا چاہتا ہے "کیوں کیا خیال ہے تمہارا؟" وہ ایک جگہ رکتے ہوئے ہوا میں گھور کر بولا اور پھر اچانک ایک کونے سے مگدر اٹھا لایا۔ اس کا دھاگا لپیٹا۔ اکڑوں

ہو کر کھاٹ کے نیچے سے ایک صندوقچہ کھینچا۔ اور اُسے کھول کر آس
پاس دیکھا مجھے صندوقچے میں روئی کی تہ پر ایک لمبا سا منحنی بھورا دھبہ
نظر آیا جس پر ہاتھ پھیر کر سانولا گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اور لٹو کو تان کر بولا۔
"روٹھ گیا۔ روٹھ گیا لٹو؟ لٹو گھماؤں؟ گھماؤں لٹو ہے ــــ اور پھر نہایت زور
سے ہنس کر اُس نے فرش پر لٹو پھینکا ــ "کیسے گھومتا ہے؟ جلد سو گیا
ہے بے چارا۔ بالکل نہیں گرے گا۔ اچھا ہے نا لٹو۔ کیوں ننھے؟ ــــ یہاں
سانولا غضبناک ہو گیا۔ "ابے کچھ منہ سے پھوٹ بھی جاگیردار کے بیٹھے۔ بکتا
کیوں نہیں۔ ہیں؟ اس وقت تو تین مہینوں ہی میں اتاولا ہو گیا اور اب جنہ
سی لیا ہے سالے۔ ابے کچھ بول بھی تیری ماں ــــ"

ایک گرجتی ہوئی گالی دے کر سانولے نے انتہائی غصے میں ایسا انداز
اختیار کر لیا جیسے کسی کو گردن سے دبوچنے والا ہو۔ بازوؤں کی کمانوں کو اکڑا کر
اور استخوانی انگلیوں کو تان کر وہ ہولے ہولے صندوقچے کے منحنی بھورے دھبے
کی طرف بڑھا۔ ساتھ ساتھ اُس نے آسیب زدوں کے سے قہقہے لگانے
شروع کیے۔ اُن قہقہوں میں قہقہہ کم تھا چیخیں اور کراہیں زیادہ تھیں۔ وہ
جبڑے پھاڑے گھٹنوں کے بل بیٹھا انگلیوں کے شکنجے کو صندوقچے کے
قریب لا چکا تھا ــ اور لٹو اسی طرح گھوم رہا تھا۔ جیسے سو گیا تھا بے چارا۔
معاً جھپٹ کر اُس نے بھورے دھبے پر انگلیاں گاڑ دیں۔ لٹو ڈولنے
لگا اور میں نے وحشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹنا چاہا۔ مگر گھٹن سے کہنی سرپوش
سے ٹکرا گئی۔ اچانک سانولے نے پینترا بدلا۔ صندوقچے کا ڈھکنا کھٹاک سے
بند کر کے اُسے کھاٹ کے نیچے دھکیل دیا اور پھر پاؤں کے انگوٹھوں
پر کھڑے ہو کر پوری شدت سے چیخا "ہٹ بزدلے دیکھنے والے کی ــــ"

شعلۂ نم خوردہ

گاؤں سے اُتر کی طرف سرکاری راکھ کے پرلے کنارے پر اسکی نانی اماں رہتی تھی۔ اسکا ماموں فوج میں بھرتی ہو کر مصر چلا گیا تھا اور اسکی ممانی قصبے کے خیراتی ہسپتال میں کمر کے درد کا علاج کرا رہی تھی۔ وہ ایک بار ممانی سے ہسپتال میں ملنے بھی گئی جس نے اسکی آمد پر خواہ مخواہ باچھیں پھیلا کر پیلے دانت دکھانے کی کوشش بھی کی اور اسے ایک اکنی بھی دی کہ وہ ہسپتال کے باہر والی دکان سے عربی کھجور خرید کر کھائے، مگر جب نانی اماں کا ذکر آیا تو اس نے ہونٹ سکیڑ کر ناک بھوؤں کی طرف اچھالی۔ اور آنکھیں مٹکا کر بولی "مزے سے پڑی ہو گی کھاٹ پر۔ جیو اں پنشن سے اسکی بہت گاڑھی چھنتی ہے وہی کھانے پینے کا بندوبست کر دیتی ہو گی۔ اسی سال کی عمر ہے اور آنکھ تک نہیں آئی اسکی اور ہم پچیس سال کے سن میں کبڑے ہوئے جا رہے ہیں۔ اپنی اپنی قسمت ہے بیٹی۔ سنا تیری ماں

کیسی ہے آجکل؟ سُنا ہے پچھلے دنوں اسکے ہاتھ پیر سوج آئے تھے!"

اُسے اپنی نانی اماں سے محبت تھی۔ اور ممانی کی زبان سے ایسے جلے کٹے طعنے سن سن کر وہ ممانی سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اُسکے کانوں کی لٹکتی ہوئی لوؤں میں بڑے بڑے سوراخ اس کے منہ کی چھائیاں۔ اس کے ناخنوں کا میل۔ اُسکے پسینے کی بدبُو ـــــ وہ ممانی کے پاس بیٹھ نہ سکی اور ماں کے کہنے کے خلاف وہاں رات بسر کرنا بھی برداشت نہ کر سکی!

وہ کئی مرتبہ کوٹلی میں نانی اماں کو ملنے گئی تھی۔ اُس کے پہونچتے ہی اس بڑھاپے کے عالم میں بھی وہ لاٹھی ٹیکتی اڑتی پھرتی۔ "یہ چیز پکاؤ وہ چیز تیار کرو۔ پانی ٹھنڈا ہو میری مریاں کے لئے۔ دیکھو یہ پنکھا ٹھیک نہیں وہ ننھی سی نازک سی کالا پائے والی پنکھی کہاں ہے؟ وہ لا ری!" اور پھر وہ مریاں کے قریب بیٹھ کر ہلکی پھلکی پنکھی کو مرجھائی انگلیوں میں گھما کر کہتی "میں بیٹی کے پنکھا جھلوں؟"

اور بیچاری مریاں کے رخسار پکے ہوئے بیروں کے طرح لال پڑ جاتے آنکھیں جھپکا کر انگلیاں چٹخاتی، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیتی۔ پہلو بدلتی اور کہتی۔ "نانی اماں۔ تم تو خواہ مخواہ مجھے شرمندہ کرتی ہو۔ تم میرے پنکھا جھلو؟ میں ڈوب نہ مروں حیا سے؟"

بڑھیا مسرت سے ہانپنے لگتی۔ مریاں کی بلائیں لیتی۔ اسکے آوارہ بالوں کی لٹیں اسکے کانوں کے پیچھے جماتی۔ اس کے جھومر اور بندوں سے لٹکے ہوئے نقرئی بندوں کو ترتیب دیتی اور پھر اسکا ڈوپٹا تھام کر پکارتی "اے بہو رانی۔ میری مریاں کا ڈوپٹہ دیکھا تو نے؟ کتنا نرم ہے؟ کتنا ہلکا ہے؟ گلاب کا پھول کیا چیز ہے اسکے سامنے!"

مریاں کی ممانی چولھے میں بغیر ضرورت کے بہت سے اُپلے گھیڑ کر
کہتی ہے۔ اچھا ہے۔ میں نے بھی اوڑھا تھا اسی قسم کا۔ پہلی دھلائی میں پھاتی
ہو جاتا ہے کمبخت۔ ٹڈیوں کا من بھاتا کھاجا ہے!

مریاں جانتی تھی کہ اسکی ممانی جھوٹ کہہ رہی ہے لیکن خاموش ہو
جاتی کیونکہ اُسکی ممانی کے غصے کے متعلق عجیب و غریب کہانیاں مشہور تھیں
ایک بار وہ اپنے شوہر سے جھگڑی اور غصے میں اپنے ننھے کا گلا دبانے پر تل گئی
ایک مرتبہ بڑھیا کے ہاتھوں سے چوبی چمچہ ٹوٹ گیا اور اس نے گھر بھر کے
سارے چمچے اکٹھے کر کے انہیں دیا سلائی دکھانا چاہی۔ مریاں مفت میں عذاب
کیوں مول لیتی اس نے اگر ایسا دوپٹہ اوڑھا ہے تو اُسے کیا۔ اوڑھا ہو گا
لیکن مریاں کی نانی اماں بہو کی یہ باتیں سنکر اپنے کپڑوں تلے سے ہونٹ
کاٹتی اور لاٹھی کو زمین سے ٹکرا کر کہتی۔

"تو نے کب اوڑھا ایسا دوپٹہ؟"

"تجھے یاد نہیں؟" بہو رانی ہنڈیا کو بلا وجہ چھلکا کر کہتی اور مریاں بڑی
مشکل سے ہنسی ضبط کرتی۔ اسے ممانی کے جھوٹ اور گھبراہٹ پر ہنسی آتی
نانی اماں کے غصہ پر ہنسی آتی۔ وہ اندر ہی اندر گھلتی رہتی اور نانی اماں دیر تک
چہرے کی گہری جھریوں سے پسینہ پونچھ کر انگلیوں کی ناہموار پوروں پر میلے
میلے قطرے اکٹھے ہوتے دیکھتی اور ہونٹوں سے کہتی "جھوٹ بکتی ہے۔ دیکھ
بیٹی، تیرے ایسا دوپٹہ لاہور والوں نے بھی نہیں پہنا۔"

دوپٹہ تو خیر جو کچھ تھا وہ مریاں جانتی تھی لیکن نانی اماں کی محبت اس
کے دل میں گھر کر چکی تھی اور اب جب کہ مریاں کی ممانی ہسپتال میں تھی
اور نانی اماں گھر میں اکیلی رہ گئی تھی، مریاں اکثر سوچا کرتی تھی کہ وہ ہفتہ بھر

کے لئے کوٹلی چلی جائے اور اس کی جی بھر کر خدمت کرے لیکن اسکے دونوں بھائی فوج میں بھرتی ہو کر منی پور پہونچ چکے تھے۔ اسکا باپ ایک بلوے کے مقدمے میں گرفتار ہو کر دو سال کی قید بھگت رہا تھا۔ اور اسکی ماں کی دیکھ بھال کیلئے کوئی ایسی ہمدرد پڑوسن بھی تو نہیں تھی جو کنوئیں سے پانی بھر لاتی۔ دو وقت کھانا پکا دیتی اور پھر اُسکی کالی گائے اور بھوری بکری اور تیرہ مرغیاں!

لیکن ایک روز جب وہ آنگن کے شیشم کے نیچے بیٹھی ماں کے پرانے جوتے کی مرمت کر رہی تھی اور اسکی ماں اندر ایک چولھے کو تازہ مٹی سے لیپ رہی تھی تو سامنے گلی سے ایک ادھیڑ عمر کی قدر رت سر پر ایک بہت بڑی گٹھڑی اٹھائے گزری، پسینے کی ایک نہ ختم ہونے والی دھار اُس کی ٹھوڑی سے گزر کر اسکے کالے جوتے کو بھگوئے دے رہی تھی!

وہ پلٹی اور آنگن میں مریاں کے قریب آکر بولی "بیر لوگی بیٹی؟"

"بیر؟" مریاں بولی۔ "ہے امی! تازہ بیر لے لوں؟ پکائے ہیں!"

"کیا سمجھائے ہے؟" چولھے کے قریب سے آواز آئی۔

بیر بیچنے والی پکاری۔ "پیسے کی چار مٹھائیاں!"

"پانچ دو گی؟"

"نہیں بڑی بی! پہاڑیوں اور کانٹے والی جھاڑیوں پر چڑھتے چڑھتے ہاتھ پیر چھلنی ہو رہے ہیں۔ بیر اکٹھے کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ادھر تیری پڑوسن کو بھی چار ہی مٹھائیاں دی ہیں!"

"ساڑھے چار؟"

"ہاں ہاں خالہ۔ ساڑھے چار مٹھیاں" مریاں نے چولا چٹائی پر رکھتے

ہوئے کہا۔

اور بیر بیچنے والی گٹھڑی کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی "بے اب ذرا تھام گٹھڑی کو۔ ساڑھے چار ہی لو۔ پر کسی کو بتانا نہیں میں لٹ جاؤنگی!"

بیر جھولی میں ڈالتے ہوئے مریاں بولی "کہاں کی رہنے والی ہو خالہ؟"

"کوٹلی کی"

"کوٹلی کی!" مریاں پکاری۔

اور مریاں کی ماں مٹی سے لت پت ہاتھ جھٹکتی اٹھی "کوٹلی کی؟" اور جب اس طرف آ کر بڑھیا کو دیکھا تو پکار اٹھی "فتا! ایں بہن سھاگ بھری!"

بیر بیچنے والی کی آنکھیں چمک اٹھیں "تم یہاں رہتی ہو بھنو! قرآن کی قسم میں نہیں جانتی تھی۔ لے بیٹی۔ یہ پیسہ واپس لے لے۔ میں اپنوں سے سودا کرتی پھروں؟ توبہ! لے اور بیر لے! جھولی ادھر کر۔ ماں کی طرف دیکھتی ہے؟ ادھر لا جھولی!"

اور مریاں کی جھولی میں اس قدر بیر ڈال دیئے گئے کہ وہ جھک سی گئی!

"مجھے تو تم سے ایک ضروری بات کہنی تھی میں نے کہا چلو آگے جا کر نوراں دھوبن سے تمہارے گھر کا پتہ پوچھ لونگی۔ تمہاری ماں آج کل بیمار ہے بیٹھے بیٹھے کھانستی ہے تو گٹھڑی بن جاتی ہے بچاری کے منہ سے بلغم پونچھنے والا بھی کوئی نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ میری بیٹی کو کہنا مریاں کو یہاں بھیج دے اور ساتھ ہی مرغیوں کے جتنے انڈے مل سکیں وہ بھی لیتی آئے کہ اسے ایک دوا بنانی ہے، بڑی کمزوری ہو گئی ہے۔ کہتی تھی آج ہی مریاں کوٹلی چلی آئے!"

"امی بیمار ہے"؟ مریاں کی ماں خوفزدہ آواز میں بولی۔

"نانی اماں بیمار ہے"، مریاں بیروں بھری جھولی سنبھال کر بولی "امی

چلی جاؤں آج؟"

اسی وقت گاؤں سے مرغیوں کے انڈے جتنے ملے جس قیمت پر ملے جہاں سے ملے۔ مریاں کے بھائی کے خاکی تھیلے میں جمع کر دیئے گئے اور جب سائے کافی ڈھل گئے تو مریاں تیار ہو چکی تھی۔ اس کی ماں نے اسے بیشمار ہدایات دیں بوڑھے لوگوں کی تیمارداری کے طریقے سمجھائے۔ پڑوسن سے ہنسی مذاق سے منع کیا۔ پردیس کے سنگھٹ پر پانی بھرتے وقت دوپٹے سے اپنا سارا جسم ڈھانکنے کی تلقین کی۔ اور جب مریاں خاکی تھیلا ہاتھوں میں لٹکائے گھر سے نکلی تو اس کی ماں چھت پر چڑھ گئی اور سرکاری راکھ میں گھستی ہوئی پگڈنڈی پر بہت دیر تک مریاں کو دیکھتی رہی۔ مریاں تیز تیز قدم اٹھائے جا رہی تھی اور جب اپنے سرکاری راکھ میں قدم رکھا اور ڈھلانوں سے اترنے لگی۔ تو بالکل ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی انڈوں سے بھرا ہوا تھیلا کچھ اس طرح تھامے ہوئے تھی کہ انڈے ادھر اُدھر بالکل نہیں کھسکے۔ یونہی گھومتی پھرتی راہوں پر وہ کنکراتی۔ کنجان درختوں کی جھکی اور پھیلی ہوئی شاخوں سے بچ کر دامن سمیٹتی جب وہ ایک برساتی نالے کے قریب پہنچی تو اچانک بوندیں پڑنے لگیں۔ وہ گھبرا کر رک گئی اور اوپر دیکھا۔ گہرے کالے بادل آندھی کے دھوئیں کی طرح امڈے آ رہے تھے اور بہت دور کہیں سے کڑک کی گونج بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے چار کوس طے کئے تھے اور ابھی چھ کوس باقی تھے۔ بوندیں تیز ہو رہی تھیں۔ ذخیرے کے درختوں نے دم سادھ لیا تھا۔ پگڈنڈی کی مٹی پر بوندیں چیچک کے سے داغ ڈال رہی تھیں۔ مریاں کا چولا بھیگ کر اس کے جسم سے چمٹ گیا تو اس نے دوپٹے کی دو تہیں بنائیں اور اسے سینے پر پھیلا لیا۔ لیکن بوندیں اس سے پار گزر گئیں۔ تنہائی کے باوجود وہ اپنی نیم عریانی پر شر

مانے لگی. دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر تھیلے کو سینے پر لے آئی اور ادھر اُدھر دیکھا
بہت اونچی کالی پہاڑیوں کے پس منظر پر تیز بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ننھے پودے دیوانوں
کی طرح کانپ رہی تھیں اور آس پاس بے ڈھب پتھروں کے نیچے عجیب
الخلقت مکوڑے رینگنے لگے تھے۔ وہ گھبرا کر آگے کو جھکی ہوئی چٹانوں کی
تلاش میں نالے کے کنارے کنارے بھاگنے لگی اسے ایک چٹان مل بھی گئی
لیکن معاً اسے خیال آیا کہ وہ برساتی نالے میں کھڑی ہے۔ ابھی یہ نالا اگر بہتا ہوا
چڑھے گا اور چٹانیں وٹانیں سب ڈوب جائیں گی. وہ ایک جست بھر کر
کنارے پر آ گئی. تھیلے میں انڈے بج اٹھے. وہ ہانپتی ہوئی درخت کے کسی موٹے
تنے کی تلاش میں تھی کہ کچھ دور ایک جھکی ہوئی چٹان کے سائے میں اسے ایک
نوجوان بیٹھا نظر آیا. وہ بوندوں سے بالکل محفوظ تھا. جھکا ہوا ایک پوٹلی
کھولنے میں مگن تھا اس کے قریب ایک بکرا بیٹھا جگالی کر رہا تھا.

مریاں پہلے تو کچھ ہچکچاتی. تھیلا سینے سے لگا لیا. پنڈلیوں تک چمٹی ہوئی
چادر جو کچھ اوپر اٹھا رکھی تھی چھوڑ دی اور ننھے ننھے سنگریزے اس کے کنارے
سے لپٹ لپٹ کر اِدھر اُدھر بکھرنے لگے. بارش تیز ہو رہی تھی اور اب اسکی
نگاہیں بہت دور تک نہیں جا سکتی تھیں. وہ ٹھنڈ سے ٹھٹھر رہی تھی۔
تھیلا کلبلا رہا تھا اور اب برساتی نالے میں کچھ پانی بھی بہنے لگا تھا.

وہ سمٹتی ہوئی اس چٹان کے قریب پہنچی. تو نوجوان نے پلٹ کر
نگاہیں اٹھائیں اور مریاں کو سر سے پیر تک دیکھ کر بولا "ارے!"

"بیٹھ جاؤں ادھر؟" مریاں جیسے کسی شہنشاں کے محل میں قدم رکھ رہی
تھی۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے کہا "یہ زمین سب کے لئے ساجھی ہے"۔

مریاں نے نہایت احتیاط سے تھیلا ایک طرف رکھ دیا۔ اور چٹان سے قریباً چمٹ گئی۔ اب وہ بارش سے بالکل محفوظ تھی۔ لیکن ایک غیر شخص کی موجودگی تیز بارش سے بھی بڑا عذاب ثابت ہوئی۔ اس کی نسیں کھچ گئیں اور مٹھیوں میں کھجلی سی ہونے لگی۔ چٹان کا مس بچھو کا ڈنک معلوم ہوا۔ بکروالے یوں غور سے دیکھ رہا تھا جیسے اسکی بے بسی کو سمجھ چکا ہے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ نوجوان کی طرف نہ دیکھے۔ لیکن یونہی ایک بار اسکی پلکوں سے [illegible] نگاہ چھن کر نوجوان پر جا پڑی۔ جو لوبی بھون کر چنے چبا رہا تھا۔ اور رہ رہ کر برساتی نالے کی طرف دیکھ [illegible] تھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے بھنے [illegible] بڑھا دی اور بولا "کھاؤ"۔

مریاں کا دل دھڑاک سے جیسے رک گیا۔ [illegible] کھا گئی جیسے سانپ کی طرح چٹان کے نیچے نہر جانا چاہتی ہے۔

"مٹھی بھر تو لے لو۔ ٹھنڈ اور بارش میں چنے بڑا مزہ کرتے ہیں۔"

اس نے مٹھی تو بھر لی۔ لیکن انگلیوں کی گرفت بہت ڈھیلی تھی صرف پانچ سات دانے اٹھا سکی اور ہونٹوں کو نیم وا کر کے ایک دانہ بہت بے دلی سے زبان پر پھینک دیا اور جب اسے چبایا تو واقعی بڑا مزہ آیا۔ ساری ٹھنڈ اتر گئی اور کپکپاتے ہوئے جبڑوں میں قوت سی آ گئی۔

"کہاں کی رہنے والی ہو؟" نوجوان نے بے توجہی سے چنے چباتے ہوئے پوچھا

مریاں نے اپنے گاؤں کا نام بتا دیا۔

"کہاں جاؤ گی؟"

"کوٹلی۔"

"وہاں کون رہتا ہے تمہارا؟"

"نانی اماں"

"دیر سے چلی ہو:"

نانی اماں نے ابھی ابھی کہلوا بھیجا ہے کہ میں بیمار ہوں مجھے انڈے پہنچا جاؤ دوا کے لئے۔ یہ انڈے لئے جا رہی ہوں اس کے لئے۔"

نوجوان نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اور مریاں گھبرا سی گئی۔ آخر ہنسنے کا یہ کونسا محل تھا!

"عجیب بات ہے"! نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں بھی نانی اماں کے ہاں ہی جا رہا ہوں۔ وہ بھی بیمار ہے" تم اپنی نانی اماں کے لئے انڈے لئے جا رہی ہو اور میں ـــــ یہ بکرا ـــــ دوا کیلئے"!

مریاں نے مسکرا کر گردن ایک طرف جھکا دی اور بکرے نے جگالی کرتے ہوئے دونوں ہونٹ اوپر چڑھا کر کچے تربوز کے بیجوں کے سے دانت نکالے اور مریاں ہنسی۔ "تمہارا بکرا آدمیوں کی بولی سمجھتا ہے"!

نوجوان ہنس دیا

"تم کہاں کے رہنے والے ہو"؟

نوجوان نے اپنے گاؤں کا نام بتا دیا

"کہاں جاؤ گے"؟

"نمل"

"وہاں کون رہتا ہے تمہارا"؟ اور پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "ہاں ہاں۔ تمہاری نانی اماں رہتی ہے وہاں نمل یہاں سے کے کوس ہے"؟

"دس کوس"

"بہت دور ہے"!

"بارش نہیں تھم رہی!"

"ہاں۔ برسے ہی جا رہی ہے!"

"رات کہاں کاٹیں گے؟"

"رک جائے گی بارش!"

"اگر نہ رکی؟"

"تو یہیں!" ۔۔۔ لیکن یہ الفاظ کہنے کے بعد اچانک مریاں کے دل میں جیسے نشتر سا چبھ گیا۔ یہیں! یعنی اسی تنگ سی جگہ میں! اس سنسان ویران راکھ میں! رات کے وقت! غیر آدمی کے ساتھ ۔۔۔ نہیں!

نوجوان نے پوٹلی باندھتے ہوئے کہا "یہ ہمارا شام کا کھانا ہے تمام پڑے کھائیں گے"۔

"ہوں"

"نالا چڑھ آیا ہے"۔

"ہوں"۔

"بارش رکی تو چند گھڑیوں کے بعد یہ بھی اتر جائے گا"۔

"ہوں"۔

"تمہاری نانی اماں کے برس کی ہیں؟"

"اسی برس کی!"

نوجوان پھر زور سے ہنسا۔ عجیب بات ہے سب لوگوں کی نانیوں کی عمر اسی برس ہی ہوتی ہے!"

مریاں مسکرائی!

اب بارش نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ بکرا گھبرا کر نوجوان اور مریاں

کے درمیان دبک گیا اور مریاں کے پہلو میں اپنا سر گھسیٹرنے لگا۔ نوجوان نے بکرے کو اپنی طرف کھینچا اور مریاں بکرے کے ننھے ننھے سینگوں پر ہاتھ رکھ کر بولی "کیا کہتے ہو بیچارے کو بٹھا رہے۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی!"

نوجوان کی آنکھیں مسکرائیں "تمہارا باپ کیا کام کرتا ہے"؟

"قید ہے"۔

"قید ہے"؟

"ہاں قید ہے۔ بلوا ہوا تھا ایک۔ برچھا ہاتھ میں آگیا اور ایک شخص کی ران کاٹ دی"۔

"تمہارا باپ"؟

"ہل چلاتا ہے"

"تم خود"؟

"میں بیکار ہوں"۔

"فوج میں بھرتی ہو جاؤ"۔

"بچپن میں بازو ٹوٹ گیا تھا۔ ڈاکٹر نکال دیتا ہے۔ کہتا ہے کہنی پر گانٹھ پڑ گئی ہے"۔ اور اس نے اپنی کہنی ٹٹولی۔

"پولیس میں ہو جاؤ"۔

"میں پولیس سے گھبراتا ہوں"۔

"کیوں"؟

"گنہگاروں کا تو معاملہ ہی الگ ہے۔ بیکسوں اور بے گناہوں پر ظلم ہوتے میں نہیں دیکھ سکتا۔ میرا ایک دوست ہے دھوبی۔ بڑا اچھا گبرو۔ بڑی اچھی کبڈی کھیلتا ہے۔ ایک بار کبڈی کے میلے میں سے گھسیٹ کر لے گئے اسے بیگار پر۔ تھانیدار کے لئے ایک کتا لانا تھا گوالاں سے۔ میں میلے میں موجود نہیں

تھا. ورنہ الجھ پڑتا پولیس سے! حوالات میں جاتا مگر ایک دو کے جبڑے تو دھن ڈالتا. ایک دو کی پسلیاں تو چٹخاتا! بہت غصہ آتا ہے مجھے ان جنگل کے داروغوں، پولیس کے سپاہیوں اور ان ذیلداروں نمبرداروں پر ـــ ان سے کوئی پوچھے آخر غریب کا گھر ڈھانے میں کونسی جوانمردی ہے. ذرا ہم جیسوں سے بات کریں تو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیں کمبختوں کو"!

مریاں نوجوان کے اکڑے ہوئے بازوؤں اور لال چہرے کو دیکھ کر مرعوب سی ہو گئی!

"قرآن کی قسم کوئی اجنبی بھی مجھے کہے کہ اس پر ظلم ہوا ہے اور فلاں نے یہ ظلم کیا ہے تو مجھے ایک گھڑی چین نہیں آتا. اسی لئے کئی بار الجھا ہوں علاقے کے سفید پوشوں سے. پچھلے دنوں ہمارے گاؤں کے ایک چمار سے ہسپتال والے ڈاکٹر نے بیس روپئے کا جو تا مفت لے لیا. صرف اس لئے کہ اسکی بیوی کو کمر کے درد کی شکایت تھی اور وہ ہسپتال میں تھی ـــ بڑا اندھیر مچ رہا ہے یہاں. سوچتا ہوں بس چلے تو سرکار کے آگے ان سب دوہری بھوڑیوں کی قلعی کھول دوں"!

مریاں نوجوان کی نرم دلی کو جی ہی جی میں سراہ رہی تھی اور آنکھوں میں چمک اور رخساروں پر خون اچھلنے سے وہ بہت اچھا لگ رہا تھا. اچانک وہ باہر جھانک کر بولا "بارش تھم گئی"!

"تھم گئی؟" اور مریاں نے باہر جھک کر آسمان کی طرف دیکھا.

"بادل چھٹ گئے"!

"ہاں چھٹ رہے ہیں"!

"دل چھٹنے میں ابھی بہت دیر ہے. وہ بادل گزر رہے ہیں سورج پر سے"!

"کہاں؟" مریاں باہر نکل آئی۔
"وہ سامنے سپید سے درخت کی دائیں طرف کی ٹہنی کی آڑ میں۔"
"ہاں ہاں ـــــ ابھی بہت وقت ہے۔"
"چلیں؟"
"چلو۔"
"پر تم تو ادھر اُنز کی پگڈنڈی پکڑو گی۔"
"ہاں۔"
اور میں ذرا اس طرف کو پھر جاؤں گا۔ تمل ادھر ہے نا۔"
"اچھا!"
"نالہ بھی اتر رہا ہے۔"
"تھوڑا سا پانی باقی ہے۔"
"یہ بھی بہہ جائے گا۔"
"پر پانی میں سے گزرنا ضرور پڑے گا۔"
"میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں پار پہنچا دوں؟"
"اور بکرا؟"
"کاندھے پر۔"
"میرے پاس انڈوں کا تھیلا بھی ہے۔"
"وہ دوسرے کاندھے پر ـــــ لیکن میرا خیال ہے پانی اُترنا گہرا نہیں"
اور جب نوجوان نے بکرا اپنے کاندھے پر لٹکا سا لیا اور مریاں تھیلے کو سینے سے چمٹائے باہر آئی اور جب دونوں نالے کے قریب پہنچے تو اچانک نوجوان نے بکرا اتار کر زمین پر کھڑا کر دیا اور پوٹلی کھولتے ہوئے بولا بھول

گیا میں لو یہ تھوڑے سے چنے اپنے پاس رکھ لو۔ راہ میں کام آئیں گے لو!
اور پھیلی ہوئی پوٹلی سے مریاں نے بہت سے دانے اٹھا کر بھیگے ہوئے آنچل میں ڈال لیئے۔ اسکی کنپٹیاں تپ اٹھیں اور سامنے برساتی نالے کی کف آلود سطح پر اسے عجیب عجیب سے رنگ برنگے سائے سحر کرتے دکھائی دیئے اس نے ایک بہت گہری سانس لی اور نوجوان کی طرف اسطرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہے۔ "بھئی تم کتنے اچھے ہو!"

اور جب دونوں نے نالے میں قدم دھرا تو نوجوان نے مریاں سے تھیلا لے کر اپنے کاندھے پر رکھ لیا۔ وہ آگے بڑھ گیا اور مریاں نے جب پانی سے بچنے کیلئے پنڈلیوں پر سے چادر اٹھائی تو اسے نوجوان کے آگے بڑھ جانے کی وجہ معلوم ہوئی کتنا شریف اور بہادر اور خاندانی ہے یہ مسافر! مریاں نے جی جی میں سوچا۔

پانی گھٹنوں گھٹنوں تھا نوجوان جب پرلے کنارے پہونچا تو سامنے ہی دیکھتا رہا اور بکرے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ اور جب مریاں پانی سے نکل کر اس کے قریب آئی تو وہ پلٹا اور تھیلا تھما کر بولا۔ "اچھا!"
"جیتے رہو" مریاں کے لبوں سے یہ الفاظ بے ارادہ نکل گئے۔ نوجوان مسکرایا اور بکرے کو گردن پر اٹھا کر تیز قدم اٹھاتا سامنے ایک موڑ پر غائب ہو گیا اور مریاں نے منہ میں دو چار چنے ڈال کر ایک بہت گہری سانس لی اور اپنی پگڈنڈی پکڑ لی۔

راستے میں اس نے بڑی بڑے مزے کی باتیں سوچیں۔ بالکل ان ہونی باتیں! ریت کے محل! وہ کوئی ایک کوس گئی کہ سامنے ایک اونچے درخت کے قریب اسے تین شہری کھڑے نظر آئے۔ انہوں نے سروں

پر انگریزی لوٹ پہن رکھے تھے اور پاؤں میں لمبے لمبے برساتی بوٹ تھے وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور لگتا ہے کہ ادھر ادھر دیکھ کر پہاڑوں کے دروں کی طرف اشارہ کر دیتے تھے اور جب مریاں ان کے قریب پہونچی تو ان میں سے ایک شخص اپنی عینک کو رومال سے صاف کرتے ہوئے بولا۔ "کہاں جائے گی لڑکی؟"

"کوٹلی۔"

"یہاں سے کے کوس ہے یہ گاؤں؟"

"کوئی پانچ کوس۔"

"کیا تو بتا سکتی ہے کہ کوٹلی میں ہمیں بیس تیس مرغے مل جائیں گے اس وقت ———— اور سو دو سو انڈے!"

"انڈے؟" مریاں نے پوچھا اور خاکی تھیلے کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر دیا!

عینک والا شخص نتھنے چڑھاتا آگے بڑھا اور خاکی تھیلے کو چھو کر بولا۔ "اس میں کیا ہے؟"

"انڈے!" ———— مریاں کا ماتھا تپ گیا اور آنکھیں پھٹ سی گئیں!

"ادھر دکھاؤ۔" اس نے تھیلا مریاں کے ہاتھ سے چھین لیا اور اسے کھول کر بولا۔ "کتنے ہونگے؟"

"جی کوئی ساٹھ ستر۔" وہ دونوں ہاتھ ملتی ہوئی بولی۔

"کے قیمت ہے ان کی؟"

"قیمت؟" دوسرا شخص جسکی ٹھوڑی کے نیچے گوشت کا

ایک لوتھڑا سا لٹک رہا تھا۔ آگے بڑھ کر بولا۔" قیمت و یمت کیسی؟ چالو لڑکی اپنی راہ لے۔ یہ انڈے ایک بڑے افسر نے منگے ہیں اس افسر کا کہنا نہ مانا جائے۔ تو قید کرا دیتا ہے۔"

"پر میری نانی اماں بیمار ہے اور میں نے ــــــ"

نانی اماں کا لفظ سنتے ہی سب یوں منہ پھاڑ کر ہنسے کہ ان کے لوٹے گردنوں پر ڈھلک گئے اور دوہری ٹھوڑی والا بولا۔ "تیری نانی اماں کے صدقے ہمارے افسر کا پیٹ بھر جائے تو کیا حرج ہے!"

"پر میرے بھیا کا تھیلا؟" ــــــ مریاں نے بلکتے ہوئے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر فریاد کی۔

"پارسل کر دیا جائے گا!" دوہری ٹھوڑی والا بولا اور ان کے کرخت قہقہوں سے پہاڑیاں جیسے پھٹ سی گئیں اور مریاں کے کانوں کے پردوں پر تپتی ہوئی سلاخیں سی رینگنے لگیں!

سر پر ہاتھ باندھ کر وہیں بیٹھ گئی۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر روتی رہی۔ اسے کئی بار اپنی نانی اماں ہچکیاں لیتی اور کھاٹ پر بل کھاتے نظر آئی اور کئی مرتبہ اس نے یوں محسوس کیا۔ جیسے اچھے خدا نے آسمان سے بے شمار مرغیاں اتاری ہیں۔ انہوں نے پر پھیلا کر انڈے دیئے ہیں اور اس کے پاس اسقدر انڈے اکٹھے ہیں کہ وہ انہیں اٹھا تک نہ سکے گی۔ لیکن جلد ہی انڈے گول گول سنگریزوں میں تبدیل ہو گئے۔ اٹھ کر اس نے کوٹلی کا رُخ کیا مگر رُک گئی وہ خالی ہاتھ نانی اماں کے ہاں کیسے جائے! نانی اماں اس کی باتیں

کب مانے گی۔ سمجھ گی انڈوں پر تم خرچ کرنے سے ڈر گئے اور اب بہانے تراشتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں۔ مجھے کوٹلی نہیں جانا چاہیئے! ــــ اور اس نے اپنے گاؤں کی راہ لی۔ اس کی پلکیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھک سی گئیں تھیں اور پتلیوں پر پانی کا پردہ سا پڑ گیا تھا۔ اس کی بھوؤں کی جڑوں میں جھبن سی ہو رہی تھی اور ہونٹ یونہی کبھی کبھی کپکپا اٹھتے تھے۔ روتی سسکتی وہ برساتی نالے کے قریب پہونچی پانی بہت تھوڑا سا رہ گیا تھا۔ وہ بغیر چادر اٹھائے نیچے پانی میں بے شمار گول گول سنگریزوں کو دیکھتی جب کنارے پر پہونچی اور اوپر دیکھا تو سامنے ہی نوجوان کھڑا تھا ــــ لال لال آنکھیں ــــ عجیب سی مسکراہٹ "لوٹ آئیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں"

"کیوں؟"

"افسروں نے انڈے چھین لئے!"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے اور پھر پریاں بولی۔

"تم بھی لوٹ آئے؟"

"ہاں"

"کیوں؟"

"افسروں نے بکرا چھین لیا!"

"انکار کر دیا ہوتا!"

"تم نے ہی انکار کر دیا ہوتا!"

"کیا تھا پر اس انکار کا یہ جواب ہے!" اور اس نے اپنی

بھیگتی ہوئی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا!

نوجوان بولا " میں نے بھی انکار کیا تھا. پر انکا یہ جواب ملا ہے!" اور اس نے گھوم کر پیٹھ پر سے چولا اٹھایا. سانولی جلد پر نیلی نیلی ڈانڈوں کا جال سا بچھا ہوا تھا اور کہیں کہیں سے خون رِس رِس کر جم گیا تھا!

دونوں کچھ دیر خاموش رہے. لڑکی نے اپنا آنچل پھیلا کر کہا.

"چنے کھاؤ"

اور نوجوان نے دو چنے منہ میں ڈالتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد کرنوں سے اس کی آنکھوں میں شہاب ثاقب کی سی چمک پیدا ہوئی. اور پھر زمین کو گھور کر بولا "اچھا!"